Regd. No. 7243

Phone 880800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

دسمبر 1985

اس پرچہ میں

اقبالؒ کی کہانی

خود اقبالؒ کی زبانی !

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام ۲۵ - بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 4 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

# طلوعِ اسلام

ماہنامہ ——— لاہور

| بدل اشتراک | | قیمت فی پرچہ |
|---|---|---|
| سالانہ<br>پاکستان /۴۸ روپے<br>غیر ممالک /۹۸ روپے | ٹیلیفون:۔ ۸۸۰۸۰۰<br>خط و کتابت<br>ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔بی گلبرگ ۲ لاہور | ۴<br>چار روپے |
| جلد ۳۸ | دسمبر ۱۹۸۵ء | شمارہ ۱۲ |

## فہرست

۱۔ نذرانۂ عقیدت بحضور رسالتمآبؐ (پرویزؒ صاحب) ——— ۲
۲۔ لمعات ——— ۵
۳۔ من و یزداں ——— ۱۵
۴۔ برقِ طور ——— ۱۶
۵۔ اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی (پرویزؒ صاحب) ——— ۱۷
۶۔ اقبال کا فلسفۂ زندگی (ثریا عندلیب) ——— ۳۷
۷۔ حقائق و عبر:۔ (۱) جمعیت علماء اسلام کے چودہ ٹکڑے (۲) اصلاحی صاحب کے دو شاگرد (۳) ہندو عورت کی مرطھی عقیدت کا مرکز (۴) مارشل لا جاری رہنا چاہیئے (۵) مسلمانوں میں بے دینی کی وجہ (۶) کتوں کی دعا سے بارش برسنا (۷) جماعت اسلامی کا امیر اور ترجمان (۸) اہلحدیث کی ضد ——— ۴۴
۸۔ اسلامی احکامات کی غلط تعبیر۔ (محمد ارمغان ثاقب) ——— ۵۱
۹۔ افکار پرویز کی صدی (محمد اسلام صاحب) ——— ۶۴

ایڈیٹر محمد خلیل، ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت ۲۵/ بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ: اشرف پرنٹنگ پریس ۹۔ ایبک روڈ لاہور

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفیٰ او را بہاست
یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفیٰ است

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۰

# نذرانۂ عقیدت
# بحضور رسالتمآب (صلی اللہ علیہ وسلم)

## وہ آئے بزم میں ....

شجرِ زندگی کی ہر شاخ سے نمی خشک ہو چکی تھی۔ تہذیب و تمدن کے پھول وحشت و بربریت کی بادِ سموم سے مرجھا چکے تھے۔ حسنِ عمل کے زندگی بخش چشمے یکسر خشک ہو چکے تھے۔ زمین پر جوہرِ انسانیت کی سرسبزی و شادابی کا کہیں نشان تک باقی نہ تھا۔ گلشتِ مذاہب و اخلاق کے حدود تو باقی تھے لیکن فصلیں بالکل اجڑ چکی تھیں۔ اس وحشت و سراسیمگی کے عالم میں، خاسر و نامراد انسان اِدھر اُدھر مارا مارا پھر رہا تھا، لیکن خدا کی اس وسیع زمین پر اسے کہیں زندگی کا نشان اور تازگی کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ چاروں طرف سے مایوس و ناامید ہو کر اس کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھتی تھیں اور ایک پکار سننے والے کو پکار پکار کر کہتی تھی کہ متیٰ نصر اللہ ! یہ وقت تھا کہ فطرت کے اٹل قانون نے اس افسردگی و پژمردگی کو پھر سے تازگی و شگفتگی میں بدل دیا۔

اس ربِ ذو المنن کا سحابِ کرم، زندہ امیدوں اور تابندہ آرزوؤں کی ہزاروں جنتیں اپنے آغوش میں لئے، ربیع الاوّل کے مقدس مہینے میں فاران کی چوٹیوں پر جھوم کر برسا اور بلدِ امین کی مبارک وادیوں میں کھل کھلا کر برسا۔ انسانیت کی مرجھائی ہوئی کھیتیاں لہلہا اٹھیں۔ اخلاق و تمدن کے پژمردہ پھولوں پر پھر سے بہار آگئی۔ عمرانیت و مدنیت کے سبزۂ پامال میں نزہت و لطافت پیدا ہو گئی۔ اعمالِ صالحہ کے خشک چشمے، حیاتِ تازہ کی جوئے رواں میں تبدیل ہو گئے۔ طغیانی و سرکشی کی بادِ سموم، عدل و احسان کی جاں بخش نسیمِ سحری میں بدل گئی۔ فضائے عالم مسرتوں کے نغموں سے گونج اٹھی۔ انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئے ولولے عطا ہوئے۔ آسمان نے جھک کر زمین کو مبارک باد دی کہ تیرے بختِ بلند نے یاوری کی اور تیرے خوش نصیب ذرّوں کو اس ذاتِ اقدس و اعظم کی پابوسی کی سعادت نصیب ہو گئی۔

جو عالمِ موجودات کے سلسلۂ ارتقاء کی آخری کڑی ہے جس سے شرف و مجدِ انسانیت کی تکمیل ہوگئی۔ جو علم و بصیرت کے اس اُفقِ اعلیٰ پر جلوہ بار ہے، جہاں عقل و عشق، ناسوت و لاہوت یہ اور وہ قوسین کی طرح آپس میں ملتے ہیں۔ جو دانشِ روحانی اور حکمتِ برہانی کے اس مقام بلند پر فائز ہے جہاں غیب و شہود کی وادیاں دامنِ نگاہ میں سمٹ کر آ جاتی ہیں۔ نوامیسِ فطرت نے "جنت سے نکالے ہوئے ابن آدمؑ کے اس طلعتِ بیدار کا تقدیس و تحمید کے زمزموں سے استقبال کیا۔ دنیا کے طاغوتی قوتوں کے تخت الٹ گئے کہ وہ آنے والا آ گیا جس کی آمد ملوکیت و قیصریت کے لئے پیغامِ فنا تھی۔ ایران کے آتشکدوں کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی کہ اب انسانی تصورات کی دنیا، نار کی جگہ نور سے معمور ہو گئی۔ دنیا کے صنم کدوں کے بت پاش پاش ہو گئے کہ آج مسلکِ ابراہیمیؑ کی تکمیل کا دن آ گیا۔ شیاطین نے پہاڑوں میں جا کر منہ چھپا لیا کہ اب جور و استبداد کی ہر طاغوتی قوت کے روپوش ہونے کا وقت آ گیا۔ دنیا سے باطل کی تاریکیاں دُور ہو گئیں کہ آج اس آفتابِ عالم تاب کا طلوع ہوا جس کے بھیجنے والے نے اسے جگمگاتا چراغ کہہ کر پکارا۔ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (٣٣/٤٥-٤٦) وہ آنے والا جس کی آمد کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ (٧/١٥٧)

جب وہ آیا تو اس نے ان تمام اغلال و سلاسل کو ایک ایک کر کے توڑ دیا۔ جس میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ احبار و رہبان کی برہمنیت کے طوق و سلاسل، قیصر و کسریٰ کی زنجیریں، توہم پرستی کی بصیرت سوز بندشیں، تقسیمِ انسانیت کے انسانیت کُش نسلی، جغرافیائی، وطنی، غیر فطری معیار، سب ایک ایک کر کے ٹوٹتے چلے گئے اور پابندِ قفس، طائرِ لاہوتی کو پھر سے آزادی کی فضائے بسیط میں، اذنِ بال کشائی عطا ہوا۔ اور انسان ایک بار پھر زمین پر سر اونچا کر کے چلنے کے قابل ہو گیا۔ انسانیت کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی سیدھی راہ مل گئی۔ عقل کو عشق کا جنون اور عقل کی فرزانگی عطا ہوئی۔ فقر کو شکوہِ خسروی اور پادشاہی کو استغنائے قلندری عنایت ہوا۔ یہ تھی وہ ذاتِ گرامی کہ

محبت از نگاہش پائدار است — سلوکش عشق و مستی را عیار است
مقامش عبدہٗ آمد و لیکن — جہانِ شوق را پروردگار است

اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ (٣٠/٥٠)

اس طرح وہ دلوں کی مُردہ بستیوں میں پھر سے زندگی کا سامان پیدا کر دیتا ہے۔

# لمعات

"یوں تو قصص قرآنی کا ہر ٹکڑا عبرت و موعظت کی ہزار داستانیں اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے اور جوں جوں نگہ دوررس غور و تدبّر سے ان کی گہرائیوں تک پہنچتی ہے ان کے حقائق و رموز زمانہ کی پیچ در پیچ لہروں کی طرح خود بخود کھلتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن ان قصص میں داستانِ بنی اسرائیل کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے اصول و مبادی اس جامعیت سے سمٹا کر رکھ دیئے گئے ہیں کہ وہ بصائر و حکم کی ایک مستقل دنیا بن گئی ہے۔ فساد آدمیت کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے۔ تین گوشے نمایاں طور پر اُبھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ استبداد حکومت کی سرکش طغیانیاں، برہمنیت کی خواب آور و فسوں خیز فریب کاریاں، اور سرمایہ داری کی پرسکون خون آشامیاں۔ ان میں سے ہر ایک فتنہ بجائے خویش انسانیت کا گلا گھونٹ دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ذرا سوچئے کہ جس دور میں بیک وقت سطح ارض پر سبعیت و بربریت کے ایسے ہولناک عفریت، فضا میں تباہی و بربادی کے ایسے ہلاکت انگیز جراثیم اور دریا کی سکوت انگیز روانیوں کے نیچے ایسے خوفناک نہنگ و اژدر موجود ہوں، وہاں خدا کی مخلوق پر کیا قیامت گذری ہوگی؟ تاریخ مصر کا یہی دور تھا جس کا تذکرہ قرآن کریم میں اس شرح و بسط سے آیا ہے۔ فرعون، استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ۔ ہامان، برہمنیت کی ابلیسانہ روباہ بازیوں کا پیکر۔ اور قارون سرمایہ داری کی لعنت کا سب سے بڑا نمائندہ۔ تینوں یکجا۔ اور ان کے آہنی پنجے میں (بنی اسرائیل کی شکل میں) تڑپتی، پھڑکتی، بلبلاتی انسانیت۔ حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کے جور و استبداد سے چھڑا کر براہِ راست اللہ کے قانون کی اطاعت میں لے آئیں"۔

(معارف القرآن جلد سوم ص ۱۸۶)

انسانیت کی پوری تاریخ پر غور کیجئے۔ جس زمانہ میں، جس قوم میں اور جس ملک میں فساد دکھائی دے، تحقیق کے بعد معلوم ہو جائے گا کہ اس فساد انگیزی میں انہی تین عناصر کا ہاتھ کارفرما ہوگا۔ ملوکیت، سرمایہ داری، اور ملائیت (PRIEST HOOD) زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ یہ ابالیس اپنے پیکر بدلتے رہیں گے، لیکن روح ہر جگہ اور ہمیشہ وہی رہے گی۔ اگر قرآن پر بہ نگاہ تعمق غور کیا جائے تو یہ حقیقت نکھر کر سامنے آجائے گی کہ حضرات انبیاء کرام کی دعوت

ہمیشہ اپنی فساد انگیز عناصر کے خلاف، دعوتِ انقلاب ہوتی تھی۔ وہ لوگوں کو قانون خداوندی کے مرکز پر جمع کرتے تاکہ ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت کے تختوں کو الٹ دیا جائے۔ وہ اسی انقلابی کوشش میں ہوتے اور ان کے خلاف یہی قوتیں سر جوڑ کر اٹھ کھڑی ہوتیں تاکہ مظلوم انسانیت ان کے پنجۂ استبداد سے نکلنے نہ پائے۔ امم سابقہ کی داستانیں جو قرآن میں مذکور ہیں اسی کشمکش کی سرگذشت ہیں۔ قرآن خدا کا آخری ضابطۂ حیات تھا اور نبی اکرم صلعم خدا کے آخری پیغمبر۔ اسی لئے قرآن کریم کے ذریعہ، نبی اکرم صلعم کے ہاتھوں اس کش مکش کو اس کے آخری مراحل تک پہنچا دیا گیا۔ ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت کی ایک ایک قوت کو پاش پاش کر دیا گیا اور انسانیت کو اس سچی آزادی اور صحیح حریت سے آشنا کرا دیا گیا جو ضابطۂ خداوندی کا منشاء و مقصود تھا۔ یہی تھے وہ سلاسل و اغلال جنہیں توڑنے کے لئے رسول اللہ صلعم تشریف لائے تھے۔ (ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم) آپ نے ان تمام زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا جن میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست　　　نقش ہائے کاہن و پاپا شکست

لیکن یہ دَور بہت تھوڑے عرصہ تک قائم رہا۔ اس کے بعد خود مسلمانوں نے ان زنجیروں کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو اپنی سر گانِ عقیدت سے ایک ایک کر کے چنا اور اس طرح اپنے گلے میں ڈال لیا کہ پھر کوئی طاقت انہیں توڑ نہ سکے۔ آسمان کی آنکھ اس تماشہ کو دیکھ کر رو رہی تھی کہ اس قوم کو کیا ہو گیا کہ

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست　　　خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

جب ہم اپنی تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو فرطِ حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ مسلمان اسی (غیر قرآنی تو ایک طرف) غیر انسانی زندگی کا اس درجہ خوگر ہو گیا کہ اسے قفس کو چھوڑ کر آشیانہ کی زندگی موت نظر آنے لگی۔ مورخین اس حیرت انگیز انقلاب کے اسباب و علل تلاش کرتے ہیں لیکن اس کے اسباب تو بالکل نمایاں ہیں۔ مفاد پرست گروہ نے اقتدار کی کرسیوں اور رزق کے سرچشموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ملائیت نے ابلیسانہ نظام کو عینِ اسلام بنانے کے لئے سندات مہیا کر دیں۔ وہ ان کے وظیفے مقرر کر دیتے تھے اور یہ منبروں پہ کھڑے ہو کر اپنے خطبات میں انہیں ظل اللہ قرار دے کر ان کی سلامتی کی دعائیں مانگا کرتے تھے۔ یہ وہی فرعون و قارون و ہامان کی ملی بھگت تھی جس کا ذکر شروع کے اقتباس میں کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ کے ایسے بندے بھی پیدا ہوتے رہے ہوں جنہوں نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہو۔ لیکن جیسا کہ ہر استبدادی قوت کیا کرتی ہے، ان کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ ان کی آواز کو دبا دیا گیا اور ان کے آثار تک کو مٹا دیا گیا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے

کہ آج ہمارے ہاں ملوکیت اور ملائیت کی تاریخ تو پوری کی پوری موجود ہے لیکن اس کے خلاف آواز اٹھانے والوں کا ذکر تک کہیں نہیں ملتا۔ بجز اس کے کہ کہیں اِدھر اُدھر، یہاں، وہاں کوئی بکھری ہوئی پنکھڑی، مسلی ہوئی مل جائے۔ اس سارے طوفانِ بلا میں اگر کوئی امید کا سہارا تھا تو یہ کہ خدا کی کتاب (غلافوں میں لپٹی ہوئی سہی) محفوظ چلی آ رہی تھی۔

یہی تھی خدا کی وہ کتاب جس پر ہمارے دور کے ایک مرد مسلمان (علامہ اقبالؒ) نے اپنے نالۂ سحری اور گریۂ نیم شبی کے ساتھ غور و فکر کیا۔ تاریخ عالم کے اوراق قوموں کے عروج و زوال کے اسباب، اور عصرِ حاضر کے علوم و فنون تک اسے پوری پوری دسترس تھی۔ وہ اس پورے سرمایہ کو لے کر قرآن کی گہرائیوں میں اترا، اور وہاں سے اس حقیقت کو پا کر باہر آیا کہ مسلمان کی یہ حالت کیوں ہو گئی۔ یہ وہی حقیقت تھی جس کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ مسلمان کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ

چار مرگ اندر پئے ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملا و پیر

اس نے مسلمان سے برملا کہہ دیا کہ

باقی نہ رہی تیری وہ آئینہ ضمیری — اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری

اس نے اپنی تمام عمر، فسادِ آدمیت کے انہی گوشوں کے خلاف جہاد میں بسر کر دی اور اسی غم میں روتے روتے ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہاں سے چلدیا اور اب عالمگیر کی مسجد کے زیر سایۂ دیوار، آسودۂ خواب ہے۔

آسماں اس کی لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اس نے مسلمان کو بتایا کہ ملوکیت کا فتنہ کس قدر غارت گیر دین و دانش ہے اور اس کے ماتحت کسطرح انسانی سیرتیں مسخ ہو جاتی ہیں۔ اس نے کہا کہ

از ملوکیت نگہ گردد دگر — عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

اس نے کہا کہ جس جگہ ملوکیت ہو، وہاں حق کا جھنڈا کبھی بلند نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسلمانوں کو کبھی اپنے آپ کو اس فریب میں نہیں رکھنا چاہیئے کہ ہماری سلطنتیں اسلام کی سلطنتیں تھیں اور ان کا نظام قرآن کا نظام تھا۔ اس نے کہا کہ

رایت حق از ملوک آمد نگوں — قریہ ہا از دخل شاں خوار و زبوں

ارمغانِ حجاز میں اقبالؒ نے خلافت اور ملوکیت کے فرق کو ایک قطعہ میں اپنے دلکش انداز میں واضح کر دیا ہے جہاں کہا ہے کہ

خلافت بر مقام ما گواہی است — حرام است آنچہ بر ما پادشاہی است
ملوکیت ہمہ مکر است و نیرنگ — خلافت حفظِ ناموس الٰہی است

"حفظِ ناموسِ الٰہی" کے معنی یہ ہیں کہ خلافت، ضابطۂ خداوندی، یعنی قرآنی نظام کی عملی تشکیل کی ذمہ دار ہوتی ہے اور اس طرح اس کے ہاتھوں دنیا میں ناموسِ خداوندی کا تحفظ ہو جاتا ہے۔ اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملوکیت کے معنی صرف اسی قدر نہیں کہ باپ کے بعد بیٹا وارث تخت و تاج ہو جاتا ہے۔ قرآن (اور اقبال) کے نزدیک ملوکیت ہر اس نظام کا نام ہے جس میں غیر قرآنی قوانین رائج ہوں، خواہ اس کی شکل پادشاہی کی ہو یا جمہوریت کی۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دنیا نے زمانے کے تقاضوں سے مجبور ہو کر (کہ جو درحقیقت خدا کے کائناتی قانون کے تقاضے ہیں) اتنی چیز کو تو تسلیم کر لیا ہے کہ باپ کے بعد بیٹا وارثِ تخت و تاج نہیں ہو سکتا، لیکن چونکہ ان کے پاس خدا کا ضابطۂ قوانین نہیں ہے اس لئے ان کی حالت اب بھی یہ ہے کہ

رست از یک بند تا افتاد در بندِ دگر

وہ اب یہ سمجھتے ہیں کہ انسانوں کی ایک جماعت (اکثریت) کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کے قوانین چاہے مرتب کر لے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ برسرِ اقتدار طبقہ اس قسم کے قوانین وضع کرتا رہتا ہے جن سے دولت کے سرچشمے ان کے ہاتھ میں رہتے ہیں اور وہ اس سرمایہ داری سے وہ کچھ کرتے ہیں جو کسی شخصی حکومت میں ایک بادشاہ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے برعکس، قرآن جہاں ملوکیت کو تباہ کرتا ہے۔ وہاں سرمایہ داری کو بھی فنا کر دیتا ہے۔ بقول اقبالؒ

چیست قرآں، خواجہ را پیغامِ مرگ — دست گیر بندۂ بے ساز و برگ
ہیچ خیر از مردکِ زرکش مجو — لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا

اقبالؒ واضح الفاظ میں بتاتا ہے کہ سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری درحقیقت آئین و دستور ملوکیت ہی کی شاخیں ہیں۔ اور شجرۃ الزقوم کی ان شاخوں کا بھی وہی پھل ہے جو خود ملوکیت کا یعنی

حاصل آئین و دستورِ ملوک — دہ خدایاں فربہ و دہقاں چو دوک

یہی وجہ ہے کہ قرآن جہاں جمع کردہ دولت کو جہنم کا ایندھن قرار دے کر آئین سرمایہ داری کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتا ہے، وہاں وہ یہ حکم دے کر وسائل پیداوار (ارض) کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں دیئے جا سکتے، زمینداری یا جاگیرداری کے نظام کہن پر بھی خط تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کا اقبالؒ نے بار بار اعلان کیا ہے کہ

حق زمیں را جز متاعِ ما نگفت — ایں متاع بے بہا مفت است مفت
دہ خدایا نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر

حتیٰ کہ اس نے بالکل کھلے ہوئے الفاظ میں کہدیا کہ

ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است — باطن "الارض للّٰہ" ظاہر است

ذرا آگے چل کر اسی (جاوید نامہ) میں کہتے ہیں کہ

رزق خود را از زمیں بُردن رواست ۔۔۔ ایں متاع بندہ و ملکِ خدا است
ارضِ حق را ارضِ خود دانی بگو ۔۔۔ چیست شرح آیۂ لا تفسدو
ابنِ آدم دل بہ ابلیسی نہاد ۔۔۔ من ز ابلیسی نہ دیدم جز فساد

اس مقام پر انہوں نے پھر اس حقیقت کو واضح کر دیا ہے کہ خلافت اور سلطنت میں یہی فرق نہیں کہ خلیفہ منتخب ہوتا ہے اور سلطان اپنی سلطنت کو وراثت میں پاتا ہے انھوں نے کہا کہ اصل فرق یہ ہے کہ

مجلسِ ملّت ہو یا پرویز کا دربار ہو ۔۔۔ ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

لیکن اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی نے اس حقیقت کو بھی بھانپ لیا تھا کہ ملوکیت، سرمایہ داری، زمینداری کی لعنتیں جس قوت کے سہارے پنپتی اور پروان چڑھتی ہیں۔ وہ ملائیت کی بنیادی لعنت ہے۔ ہر شخص جو ذرا عقل و فکر سے کام لے، بآسانی محسوس کر لیتا ہے کہ ملوکیت سرمایہ داری اور زمینداری یکسر غیر فطری نظام زندگی ہیں۔ لیکن جب مُلّا اسے یہ بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ خدا اور رسول کے حکم کے مطابق ہے اور ان سے انکار کرنے والا خدا کا سرکش اور ذاتِ رسالت کا منکر، تو وہ بیچارہ خاموش ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مُلّا آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے کہ شریعت میں عقل کا کوئی دخل نہیں۔ اگر کسی کے دل میں "خدا اور رسول" کا حکم سننے کے بعد ذرا سا شک و شبہ بھی پیدا ہو جائے تو وہ سیدھا جہنم میں جا گرتا ہے۔ اس پر بیچارہ سادہ لوح مسلمان کانپ اٹھتا ہے اور یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتا ہے کہ دین کی مصلحتیں خدا اور اس کا رسول ہی جان سکتے ہیں، ہمارا کام ایمان لانا ہے اور بس۔ حالانکہ جس چیز کو ملا خدا اور رسولؐ کے احکام بتا کر پیش کرتا ہے وہ اسی نظام سرمایہ داری کے وضع کردہ آئین ہوتے ہیں اور جن سے انکار کرنے والوں پر وہ "منکرینِ حدیث" کا لیبل لگا کر انہیں گلی کوچے میں بدنام کرتا رہتا ہے کہ یہ ایک "نیا اسلام" لیکر آ گئے ہیں، یہ خدا کے احکام کے نافرمانبردار ہیں، یہ رسول کی شانِ رسالت کے منکر ہیں۔ یہ اسلاف کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ ملوکیت اور سرمایہ پرستی کے زمانے کے پیدا کردہ احکام، خدا اور رسول کے احکام نہیں۔ لیکن مُلّا کا تو منصب ہی یہ ہے کہ وہ انہی احکام کو خدا اور رسول کے احکام بتا کر عوام کو فریب میں رکھے۔ یہ ہے وہ سب سے بڑا سحر جس کے سہارے ملوکیت اور سرمایہ داری کا نظام قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان "علمبردارانِ مذہب و شریعت" کی اس شدت سے مخالفت کی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اقبالؒ بھی عمر بھر اسی فتنۂ ملّت بیضا کے خلاف جہاد کرتا رہا۔ کہیں اس نے کہا کہ

متاعِ شیخ اساطیر کہنے بود ۔۔۔ حدیث او ہمہ تخمین و ظن بود

کتنی بڑی حقیقت ہے جسے ان سادہ اور مختصر سے الفاظ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جس چیز کا نام مُلّا نے خدا اور رسولؐ کا حکم رکھ چھوڑا ہے وہ درحقیقت اس کا خود ساختہ مذہب ہے جسے اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس کا عجمی اسلام زنار پوش ہے اور یہ اس اسلام کا برہمن۔ اسے کچھ معلوم نہیں کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔

بیا ساقی بگرداں ساتگیں را        بیفشاں بر دو گیتی آستیں را
حقیقت را بہ رندے فاش کردند        کہ ملاّ کم شناسد رمزِ دیں را

وہ کہتا ہے کہ قرآن تو اپنے الفاظ میں محفوظ ہے لیکن مُلّا اس قرآن کی تفسیر اپنے خود ساختہ تصوّرات کے مطابق کرتا ہے اور اس طرح قرآن۔ قرآن نہیں رہتا بلکہ عجمی مجوسیوں کی کتاب بن جاتا ہے۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر        تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اسی حقیقت کو وہ "ارمغانِ حجاز" میں اس انداز میں بیان کرتا ہے کہ

زمن بر صوفی و مُلاّ سلامے        کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت        خدا و جبرئیلؑ و مصطفٰے را

یعنی مُلاّ، قرآن کے الفاظ تو وہی دہراتا ہے جنہیں خدا تعالیٰ نے بھیجا، جبرئیلؑ لایا اور رسولؐ اللہ نے لوگوں تک پہنچایا۔ لیکن اس قرآن کا جو مفہوم بنتا ہے اسے دیکھ کر خدا، جبرئیلؑ، اور محمد صلعم تینوں محوِ حیرت رہ جاتے ہیں کہ یہ کون سا قرآن ہے جسے اس طرح بیان کیا جا رہا ہے۔ قرآن کا وہ مفہوم جس کے متعلق اکبر الہ آبادی نے اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں کہا ہے کہ

مری قرآں دانی پہ نہ ہوجیئے تم خفا صاحب        مجھے تفسیر بھی آتی ہے، اپنا مدعا کہئے

مُلاّ کا یہی وہ خود ساختہ مذہب ہے جس نے مسلمانوں جیسی ہمہ تن برق قوم کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا ہے۔ یہی ہے وہ حقیقت جس کے احساس سے اقبالؒ کہتا ہے کہ

مکتب و مُلاّ سخن ہا ساختند        مومناں ایں نکتہ را نشناختند
زندہ قومے بود از تاویل مُرد        آتشِ او در ضمیر او فسُرد

بظاہر مُلاّ کی باتیں سنئے تو ایسا نظر آئے گا کہ دین کی حفاظت کا درد اسے کھائے جا رہا ہے لیکن اگر اس کے دل کو ٹٹول کر دیکھئے تو اس میں سوائے مصلحت بینی اور مفاد پرستی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ خدا، رسول، قرآن، احادیث، اسلاف، مذہب، شریعت، وہ حسین اور مقدس نقاب ہیں جن کی اوٹ میں یہ اپنی مفاد پرستیوں کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

دلِ مُلاّ گرفتارِ غمے نیست        نگاہے ہست در چشمش نمے نیست
ازاں بگریختم از مکتبِ او        کہ در ریگِ حجازش زمزمے نیست

(کہ جسے قرآن نے نصِ صریح شرک قرار دیا ہے) اس کے اسلام کی اصل و بنیاد ہے۔ فرقہ بندی کی نفسیات یہ ہیں کہ فرقہ کے لوگوں کے دل میں دوسروں کی طرف سے نفرت پیدا کی جائے جس قدر نفرت شدید ہوگی اتنا ہی وہ فرقہ زیادہ مضبوط ہوگا۔ مُلّا کی ساری عمر نفرت کے جذبات کو ہوا دینے میں گذر جاتی ہے۔

سرمنبر کلامش نیشِ دار است | کہ او را صد کتاب اندر کنار است
حضورِ تو من از خجلت نہ گفتم | ز خود پنہاں و بر ما آشکار است

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے جاوید نامہ میں سعید حلیم پاشا کی زبان سے یوں بیان کیا ہے۔

دینِ حق از کافری رسوا تر است | زانکہ ملا مومنِ کافر گر است
شبنم ما در نگاہِ ما یم است | از نگاہِ او یم ما شبنم است

اس دوسرے شعر پر غور کیجئے اور دیکھئے کہ کیا مُلّا کی ساری عمر اسی "جہاد" میں نہیں گذر جاتی کہ وہ اپنے اور اپنے حواریوں کے سوا سارے مسلمانوں کو نہایت حقارت کی نگاہ سے دیکھے، ان کی ہنسی اڑائے، انہیں ذلیل سمجھے، اور اپنے آپ کو صالحین میں شمار کرے۔ ان کے متعلق وہ یہاں تک بھی کہہ دے کہ

ان کے برائے نام مسلمان رہنے سے اسلام کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں بلکہ سراسر نقصان ہے
(تنقیحات ابوالاعلیٰ مودودی صـ172)

مسلمانوں کے متعلق یہ کچھ اس وقت کہا جا رہا تھا جب ہندوستان میں مسلمان موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ ہندو کی پوری کوشش تھی کہ سارے ہندوستان پر اپنا قبضہ جما کر مسلمان کے جداگانہ تشخص کو ختم کر دے۔ اس کے خلاف تحریکِ پاکستان کے حامیوں کی کوشش تھی کہ ایک جداگانہ خطہ زمین مل جائے جو مسلمانوں کے تحفظ کا ذریعہ بن جائے۔ عین اس کشمکش کے زمانے میں مُلّا کی طرف سے یہ آوازیں بلند ہو رہی تھیں کہ یہ تحریک سراسر خلاف اسلام ہے "مردم شماری کے رجسٹر کا یہ پیدائشی مسلمان" باقی رہے یا مٹ جائے۔ اس سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑتا۔ یہ تھے وہ تاثرات جن کے ماتحت اُس مردِ مومن نے باچشم نم کہا تھا کہ

شبنم ما در نگاہِ ما یم است | از نگاہ او یم ما شبنم است

اس کے بعد اقبال سعید حلیم پاشا کی زبان سے کہتا ہے کہ

از شکرفی ہائے آں قرآں فروش | دیدہ ام روح الامیں را در خروش
زاں سوئے گردوں دلش بیگانۂ | نزد او ام الکتاب افسانۂ

مُلّا کی قرآں فروشی کی داستانوں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ لیکن ماضی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ آج اپنے سامنے دیکھ لیجئے کہ مُلّا کس جرأت اور بے باکی سے قرآن بیچ رہا ہے۔ غور کیجئے! خود پاکستان میں کتنے ایسے مُلّا ہیں جن کا بظاہر کوئی ذریعہ معاش نہیں لیکن جن کے

پاس کوٹھیاں ہیں، موٹریں ہیں، ٹیلیفون ہیں، عیش وعشرت کے سامان ہیں۔ مُلّا کا گروہ دن اور رات چلّاتا نظر آئے گا کہ حکومت کے کارندے بے ایمان ہیں، بددیانت ہیں، رشوت خوار ہیں، ان کی تنخواہیں قلیل ہیں، لیکن ان کے پاس جائیدادیں کثیر ہیں۔ لیکن آپ نے آج تک کبھی کسی مُلّا کو یہ کہتے نہیں سنا ہوگا کہ فلاں مولوی صاحب کو دیکھئے کہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں۔ (یا اگر ہے تو بہت قلیل ہے) لیکن وہ جائیدادیں بنوا رہے ہیں، ہزاروں روپے ماہانہ کا خرچ ہو رہا ہے۔ اس ٹھاٹ سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ ذرا معلوم کرنا چاہیئے کہ بالآخر یہ روپیہ کہاں سے آ رہا ہے۔ مُلّا کی نگاہ کبھی ان کی طرف نہیں اٹھتی۔ کیوں اٹھے۔ یہ تو صالحین کا گروہ ہے۔ یہ "شہداء علی الناس" کی جماعت ہے۔ ان کا کام دوسروں کے اعمال کی نگرانی ہے۔ اپنے گروہ کے متعلق لب کشائی نہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حمام میں سب ننگے ہیں۔ یہ مُلّا کے عمل کی کیفیت ہے اور علم کی یہ حقیقت کہ

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی  آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ وکور ذوق وہرزہ گرد  ملت از قالش اقولش فرد فرد

اس کے بعد وہ دو شعر سنیئے جن میں اقبالؒ[2] نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیا ہے جب کہا ہے کہ

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب  کورِ مادرزاد و نورِ آفتاب
دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد  دینِ ملّا فی سبیل اللہ فساد

یہ شعر نہیں، ایک چیخ ہے جو دل کی گہرائیوں سے اٹھی ہے اور بے ساختہ زبان سے نکل کر آسمان سے جا ٹکرائی ہے۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اسی عنوان کی تفسیر ہے کہ

"دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد"

یہ تھا حقیقت میں ابلیس کا وہ سب سے زیادہ موثر حربہ جو اس نے ملتِ اسلامیہ کیخلاف استعمال کیا۔ اسی حقیقت کو جاوید نامہ میں ابلیس کی زبان سے یوں ادا کیا گیا ہے کہ

نے حدیث و نے کتاب آوردہ ام  جانِ شیریں از فقیہاں بردہ ام
رشتۂ دیں چوں فقیہاں کس نہ رشت  کعبہ را کردند آخر خشت خشت

مُلّا کے اس مسلک فساد انگیزی، نفرت خیزی، اور فتنہ جوئی کو اقبالؒ نے ذرا شوخ انداز میں (بالِ جبریل میں) اس طرح بیان کیا ہے۔

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا  حق سے جب حضرت مُلّا کو ملا حکمِ بہشت!
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف  خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال اقول !  بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزئ اقوام و ملل کام اس کا  اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت !

اقبالؒ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے سمجھ لیا تھا کہ مُلّا کے اس جذام کا اس کے سوا کوئی علاج نہیں کہ عوام کو مُلّا کے ہاتھ سے چھڑا لیا جائے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلمانوں کے عوام کے دل میں بڑا خلوص ہے اور وہ ہر ممکن قربانی کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں

خیر و خوبی برخواص آمد حرام　　دیدہ ام صدق و صفا را در عوام

اس نے اسے بھی محسوس کیا کہ عوام بڑے سادہ لوح ہیں اور مُلّا انہیں مذہب کے نام پر ابھار کر اپنی مفاد پرستیوں کا آلۂ کار بنا لیتا ہے۔ یہی تھی وہ حقیقت جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس نے کہا کہ

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام

اس کا علاج اس کے نزدیک اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں قرآن کے نظام کو از سرِ نو قائم کیا جائے۔ جونہی وہ نظام قائم ہو گیا ملوکیت، سرمایہ داری اور ملائیت خود بخود فنا ہو جائے گی کہ

ایں صنم تا سجدہ اش کردی خدا است　　چوں یکے اندر قیام آئی فنا است

یہ تھا وہ مقصدِ جلیلہ جس کے لئے اس مردِ خدا اندیش نے پاکستان کا تصوّر دیا۔ یہ خطۂ زمین مل بھی گیا لیکن اس وقت جب اقبالؒ یہاں سے جا چکا تھا۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہی جذام جسے دُور کرنے کیلئے اس نے اس خطۂ زمین کے لئے دعائیں مانگی تھیں چاروں طرف سے امنڈ کر اسی خطۂ زمین میں جمع ہو گیا۔ اور آج حالت یہ ہے کہ

زاغوں کے تصرّف میں ہے شاہیں کا نشیمن

کتنا حسین تھا وہ خواب اور کس قدر بھیانک ہے اس کی یہ تعبیر۔ اگر چندے یہی کیفیت اور رہی تو کچھ بعید نہیں کہ یہ خواب پھر سے خوابِ پریشان بن جائے۔

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے　　فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

لیکن جب تک قرآن باقی ہے ہمارے لئے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔

محفلِ ما بے مئے و بے ساقی است　　سازِ قرآں را نواہا باقی است

زخمۂ ما بے اثر افتد اگر!　　آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور

ذکرِ حق از امتاں آمد غنی　　از زمان و از مکاں آمد غنی

حق اگر از پیشِ ما بردار دش　　پیشِ قومے دیگرے بگذار دش

ایسے وقت میں اتنا صدمہ ضرور ہو گا کہ

ترسم از روزے کہ محرومش کنند　　آتشِ خود بر دلِ دیگر زنند

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَنْ يَرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَسَوْفَ يَأْتِي اللَّهُ

بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ
يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ
اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ( ۵۴/۵ )

ترجمہ :- اے ایمان والو! جو تم میں سے نظامِ خداوندی سے روگردانی اختیار کرے گا تو اس قوم کی جگہ اللہ تعالیٰ ایسی قوم کو لے آئے گا جو نظامِ خداوندی سے محبت رکھے گی اور وہ نظام اس قوم کو اپنے لئے خوش آئند پائے گا۔ اس قوم کے افراد کی خصوصیات یہ ہوں گی کہ ان لوگوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے رہیں گے جو اس نظام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیں (جو مومن ہوں) لیکن مخالفین کے مقابلے میں بڑے سخت ہوں گے۔ وہ اس نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لئے جان تک لڑا دیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ وہ فضلِ ایزدی ہے جو ہر اس قوم کے نصیب ہو سکتا ہے جو اسے حاصل کرنا چاہے۔ یاد رکھو۔ اللہ کا قانون زندگی کی خوشحالیوں اور کشادگیوں کا حامل ہے اور ہر قوم کے اعمال سے باخبر۔

ماخوذ از طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۵۳ء


# مطالب الفرقان جلد ششم

اس میں سورۃ الاعراف کی آیات ( ۱۵۹ تا ۲۰۶ )، سورۃ انفال کی کل آیات ( ۱ تا ۷۵ )، سورۃ توبہ کی کل آیات ( ۱ تا ۱۲۹ ) سورۃ یونس کی کل آیات ( ۱ تا ۱۰۹ ) اور سورۃ ھود کی کل آیات ( ۱ تا ۱۲۳ ) آ گئی ہیں، جو بیشتر مشتمل ہیں۔ حضراتِ انبیاء سابقہ کے کوائفِ حیات اور اقوامِ گذشتہ کے نہایت عبرت خیز واقعات پر، جو احباب سلسلۂ مطالبُ الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تصریفِ آیات کے اصول کے مطابق جس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر، ان مجلدات میں پیش کی جا رہی ہیں اس سے قرآنی حقائق کسطرح نکھر کر سامنے آ جاتے ہیں۔

یہ جلد اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ کے ( ۴۳۶ ) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے
کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دلکش
قیمت فی جلد -/۷۵ روپے۔ محصول ڈاک -/۸ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵- بی گلبرگ ۲ لاہور
(۲) مکتبہ درون ودانش، چوک اردو بازار لاہور

# خدا پر ایمان

دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں ملتا ہے لیکن اس کے
باوجود قرآن ان کے اس ایمان کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ اسلئے
کہ
ان کے ہاں خدا کا صحیح تصوّر نہیں

# خدا کا صحیح تصوّر

خود خدا ہی کے ہاں سے مل سکتا ہے یعنی قرآن مجید سے۔ خدا کا یہی وہ
تصوّر ہے جسے پرویز صاحبؒ نے اپنی معرکہ آرا کتاب

# من و یزداں

میں نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے نیز یہ بھی بتایا ہے کہ ہم خدا پر کیوں ایمان لاتے ہیں
اور انسان اور خدا کا تعلق کیا ہے۔ بڑی پر از حقائق کتاب ہے
(تازہ ایڈیشن شائع ہوگیا)
بڑا سائز۔ ضخامت ۴۰۶ صفحات۔ کاغذ اعلیٰ۔ جلد مضبوط مزین اور مطلاّ
قیمت فی جلد-/۷۵ روپے علاوہ محصول ڈاک

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) ۲۵۔بی گلبرگ نمبر ۲ لاہور

مکتبہ دین و دانش۔ چوک اُردو بازار۔ لاہور

# برقِ طور

## (تازہ ایڈیشن شائع ہو گیا)

آسمانی انقلاب کے داعیان، انبیاء کرام کے سلسلہ کی دوسری کڑی ہے۔ اس میں ایک طرف صاحب ضربِ کلیم (حضرت موسیٰؑ ہیں) اور استبدادِ ملوکیت کا مجسمہ فرعونؔ.... مذہبی پیشوائیت کا سرغنہ ہامانؔ اور نظام سرمایہ داری کا نمائندہ قارونؔ دوسری طرف .... اس کے ساتھ ہی بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان بڑے عبرت آموز انداز میں سامنے لائی گئی ہے۔ بڑی بصیرت افروز اور حقائق کشا تصنیف ہے۔

بڑا سائز، ضخامت ۳۳۶ صفحات، کاغذ اعلیٰ جلد مضبوط مزیّن اور مُطلّا
قیمت فی جلد/۶۰ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

| | |
|---|---|
| ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) | ۲۵۔بی گلبرگ ۲<br>لاہور |

مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور

# اقبالؒ کی کہانی خود اقبالؒ کی زبانی

یہ کہانی "سوانحِ عمری" نہیں ہے جس میں ترتیبِ واقعات کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ یہ صرف اقبالؒ کے قلب و دماغ کی مختلف کیفیتوں کا مطالعہ ہے جسے زمان و مکان کی قیود سے الگ ہٹ کر پیش کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس "کہانی" کو اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھئے۔ طلوعِ اسلام

برادرانِ عزیز!

علامہ اقبالؒ نے اپنے آخری کلام، ارمغانِ حجاز میں کہا ہے کہ

چو رختِ خویش بربستم ازیں خاک     ہمہ گفتند با ما آشنا بود!
ولیکن کس ندانست ایں مسافر     چہ گفت و با کہ گفت و از کجا بود

جب کیفیت یہ ہے کہ خود اقبالؒ کے اپنے اندازے کے مطابق، کوئی شخص اقبالؒ کی حقیقت سے کما حقہٗ واقف نہیں ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر حقیقی اقبالؒ کی جھلک دیکھی کہاں سے جائے؟ اس سوال کا جواب چنداں مشکل نہیں۔ اس لئے کہ اقبالؒ خود اپنے متعلق اتنا کچھ کہہ گیا ہے کہ اس سے اقبالؒ کی پوری تصویر نگہِ تجسس کے سامنے آجاتی ہے۔ میرے لئے یہ تو مشکل ہے کہ اس مختصر سے وقت میں اس تصویر کے تمام گوشوں کی تفاصیل آپ کے لئے جنتِ نگاہ بنا سکوں۔ اس وقت صرف اتنا ہو سکے گا کہ اس کے ابھرے ہوئے نقش و نگار اور نمایاں خط و خال سامنے لائے جا سکیں۔ اس مرقعِ نگہ تاب اور پیکرِ خوش انداز کی تفصیلی گلکاریوں اور جلوہ طرازیوں کو میں نے اپنی اس تالیف کے لئے اٹھا رکھا ہے جو "پیامِ اقبالؒ اور قرآنِ کریم" کے عنوان سے میرے پیشِ نظر ہے اور جسے میں، حضرت علامہ کے ان احساناتِ عظیم کے زیرِ احساس، جن سے میری نگہ تشکر ہمیشہ نگوں سار رہی ہے، اپنے ذمہ ایک قرض سمجھتا ہوں۔ خدا مجھے اس قرضِ حسنہ سے سبکدوش ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

اس وقت میری دوسری مشکل یہ ہے کہ حضرت علامہ کے کلام کا بیشتر حصّہ فارسی میں ہے اور اس قسم کا مخلوط مجمع فارسی زبان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مجھے مجبوراً ان کے اردو کلام ہی پر اکتفا کرنا ہوگا اور فارسی اشعار صرف ان مقامات پر پیش کئے جائیں گے جہاں ایسا کرنا ناگزیر ہو۔

---

انیسویں صدی کے آخرِ شب کے ستارے جھلملا رہے ہیں اور بیسویں صدی کی نازنینۂ سحر انگڑائیاں لے رہی ہے۔ قلب زارہ دلانِ پنجاب، یعنی لاہور کی کیف بار فضائیں، شباب و شعر کی نکہتوں اور رنگ و نظر کی نزہتوں سے دامانِ باغبان و کفِ گل فروش کا منظر پیش کر رہی ہیں۔ گورنمنٹ کالج کی درسگاہ اپنے معیارِ تعلیم کی بلندی کے ساتھ ساتھ دولت مند خاندانوں کے عشرت پسند نونہالوں کی لاُابالیوں کے لیئے دور دُور تک شہرت حاصل کر چکی ہے، کہ اتنے میں سیالکوٹ کے ایک متوسط خاندان کا نہایت ذہین طالب العلم اس حیرت کدۂ علم و تماشا میں آنکلتا ہے۔ شروع شروع میں جہاں وہ نوجوان اس فضا کو اپنے لئے غیر مانوس پاتا ہے، وہاں خود وہ فضا بھی اس نووارد کو اجنبی سا محسوس کرتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ کیفیّت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ نووارد طالب علم اپنی سحر طرازیوں سے اس پوری فضا پر چھا جاتا ہے اور جس محفل میں شریک ہو جاتا ہے اسے تبسّم فشاں و قہقہہ بار بنا دیتا ہے۔ تعلیمی منازل میں اس کا یہ عالم ہے کہ اساتذہ اس کا معلّم کہلانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ دوستوں کی مجلس میں یہ کیفیّت ہے کہ ہر شخص اس سے قریب تر ہونے میں ایک خاص نشاطِ روح محسوس کرتا ہے۔ اس کی شرکت سے شعر و سخن کی محفلوں میں ایک تازہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ تھوڑے ہی دنوں میں یہ محسوس ہونے لگ جاتا ہے کہ اس سے پیشتر لاہور محض ایک پیکرِ آب و گل اور اس میں زندگی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ پہلے پہل ابھی مسکرائی ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس نوجوان کی حالت یہ ہے کہ وہ اس محفلِ طرب و نشاط کے کسی ساز کو اپنا ہم آہنگ اور اس گلکدۂ حسن و تماشا کے کسی پھول کو اپنا ہم رنگ نہیں دیکھتا۔ اسے ہر ایک اپنا ہمنوا اور ہم ذوق سمجھتا ہے لیکن وہ کسی کو بھی اپنا ہم صفیر و ہم نگاہ نہیں پاتا۔ اس کی شرکت سے اجڑی ہوئی محفلوں پر بھی بہار آجاتی ہے لیکن یہ بھری محفلوں میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا ہے سا ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی شے کی جستجو ہے جس نے اسے سراپا اضطراب بنا رکھا ہے۔ کوئی خلشِ تجسّس ہے جو اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دیتی۔ وہ اپنی تشنگیٔ ذوق کی تسکین کے لئے ہر دُور سے نظر آنے والے چشمہ کی طرف لپکتا ہے لیکن اسے سراب پا کر مضطرب و بیقرار واپس آجاتا ہے۔ وہ کبھی اسی تسکینِ خاطر کے لئے لارنس گارڈن میں جا نکلتا ہے لیکن اس جہانِ رنگ و بو کی جمال افروز شادابی و شگفتگی بھی اس کے لئے جاذبِ نگاہ نہیں بنتی۔ وہ ایک حسین شاخ پر چہچہانے والے "گلِ رنگین" کو نہایت غور سے دیکھتا اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں　　اے گلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں
زیبِ محفل ہے، شریکِ شورشِ محفل نہیں　　یہ فراغت بزمِ ہستی میں مجھے حاصل نہیں
اس چمن میں، میں سراپا سوز و سازِ آرزو
اور تیری زندگانی بے گدازِ آرزو
سو زبانوں پر بھی خاموشی تجھے منظور ہے　　راز وہ کیا ہے ترے سینے میں جو مستور ہے
میری صورت تو بھی اک برگِ ریاضِ طور ہے　　میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے
مطمئن ہے تو، پریشاں مثلِ بو رہتا ہوں میں
زخمیٔ شمشیرِ ذوقِ جستجو رہتا ہوں میں

ہو سکتا تھا کہ وہ اس خلشِ پیہم اور سوزِ مسلسل کے ہاتھوں "تنگ آکر اپنی زندگی کا رُخ بدل لے" لیکن کوئی بے صوت صدا ہے جو چپکے ہی چپکے اس کے کان میں کہہ دیتی ہے اور وہ خود ہی پکار اٹھتا ہے کہ نہیں! مجھے گھبرانا نہیں چاہیئے۔ کہیں۔

یہ پریشانی مری سامانِ جمعیت نہ ہو؟　　یہ جگرسوزی چراغِ خانۂ حکمت نہ ہو؟
ناتوانی ہی مری سرمایۂ قوت نہ ہو؟　　رشکِ جامِ جم مِرا آئینۂ حیرت نہ ہو؟
یہ تلاشِ متصل، شمعِ جہاں افروز ہے
توسنِ ادراکِ انساں کو خرام آموز ہے

یہ تسکین اسے پھر آمادۂ تجسس کر دیتی اور وہ ہلاکِ ذوقِ جستجو پھر اسی تپش و خلش کے لئے سیماب پا ہو جاتا۔ جب اس سے پوچھا جاتا کہ بالآخر اس سوزِ پیہم اور خلشِ مسلسل کی وجہ کیا ہے؟ ہر شخص نے اپنی زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصود متعین کر رکھا ہے اور اس کا دل اس سے مطمئن ہے لیکن ایک تم ہو کہ تمہیں کسی پہلو قرار ہی نہیں۔ کوندے کی لپک کی طرح یہاں سے وہاں، اور شعلے کی تڑپ کی طرح وہاں سے یہاں۔ وہ سب کچھ سنتا اور ایک آہ بھر کر کہہ دیتا کہ

چہ کنم کہ فطرتِ من بہ مقام در نسازد　　دلِ ناصبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے
چو نظر قرار گیرد بہ نگارِ خوبروئے　　تپد آں زماں دلِ من پئے خوب تر نگارے
ز شرر ستارہ جویم، ز ستارہ آفتابے　　سرِ منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے
طلبم نہایت آں کہ نہایتے نہ دارد　　بہ نگاہِ ناشکیبے، بدلِ امیدوارے

اس کی فطرت کی یہی سیمابیت اور ذوقِ جستجو کی اضطرابیت تھی جو اسے ہر محفل میں دیوانہ وار لئے لئے پھرتی تھی۔ کبھی حکمت و فلسفہ کی خشک گھاٹیوں میں، کبھی شعر و ادب کی شاداب وادیوں میں، کبھی مسجد و خانقاہ کی خلوتوں میں اور کبھی محفلِ رنگ و چنگ کی جلوتوں میں۔ اور یہ سب کچھ اس بے باکانہ اعتراف کے ساتھ کہ

[illegible] ساختیم　　عشق با [illegible] باختیم

بادہ ہا باماہ سیمایاں زدم — بر چراغ عافیت داماں زدم

چنانچہ اس کی یہ ہرزہ نوردی اور ہر منزل نشینی کی کیفیت جسے قرآن نے فی کل واد یھیمون کی شاعرانہ نفسیاتی کیفیت سے تعبیر کیا ہے، دیکھنے والوں کے دل میں اس کے متعلق عجیب وغریب خیالات پیدا کیا کرتی۔ اسی کیفیت کو ایک مولوی صاحب کی زبان سے سنئے جو اس زمانہ میں اقبالؒ کی ہمسائیگی میں رہتے تھے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں

حضرت نے میرے ایک شناسا سے یہ پوچھا — اقبالؒ کہ ہے قمری شمشاد معانی
پابندیٔ احکامِ شریعت میں ہے کیسا؟ — گو شعر میں ہے رشکِ حکیم ہمدانی
سمجھا ہے کہ ہے راگ عبادات میں داخل — مقصود ہے مذہب کی مگر خاک اڑانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے — عادت یہ ہمارے شعراء کی ہے پرانی
گانا جو ہے شب کو تو سحر کو ہے تلاوت — اس رمز کے اب تک نہ کھلے ہم پہ معانی
لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے — بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی

اس شہر میں جو بات ہو اڑ جاتی ہے سب میں — میں نے بھی سنی اپنے احبا کی زبانی
ایک دن جو سر راہ ملے حضرت زاہد — پھر چھڑ گئی باتوں میں وہی بات پرانی
میں نے یہ کہا کوئی گلہ مجھ کو نہیں ہے — یہ آپ کا حق تھا ز رہِ قرب مکانی
گر آپ کو معلوم نہیں میری حقیقت — پیدا نہیں کچھ اس سے قصورِ ہمہ دانی
میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا — گہرا ہے میرے بحر خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبالؒ کو دیکھوں — کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اقبالؒ بھی اقبالؒ سے آگاہ نہیں ہے
کچھ اس میں تمسخر نہیں، واللہ نہیں ہے

واعظ کو اس قسم کے مسلک سے وجۂ شکایت بجا تھی لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس باب میں رندانِ میکدہ بھی کچھ کم گلہ طراز نہ تھے۔ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اقبالؒ ہے کیا؟ وہ بھی یہ کہتے تھے کہ

ہے عجب مجموعۂ اضداد اے اقبالؒ تو — رونقِ ہنگامۂ محفل بھی ہے، تنہا بھی ہے
عین شغلِ مے میں پیشانی ہے تیری سجدہ ریز — کچھ ترے مسلک میں رنگِ مشربِ مینا بھی ہے
ہے حسینوں میں وفا نا آشنا تیرا خطاب — اے تلون کیش! تو مشہور بھی رسوا بھی ہے

لے کے آیا ہے جہاں میں عادتِ سیماب تو
تیری بے تابی کے صدقے ہے عجب بیتاب تو

یہ سنکر اقبالؒ مسکراتا اور کہتا کہ

عشق کی آشفتگی نے کر دیا صحرا جسے — مشتِ خاک ایسی نہاں زیرِ قبا رکھتا ہوں میں

آرزو ہر کیفیت میں اک نئے جلوے کی ہے — مضطرب ہوں، دل سکوں نا آشنا رکھتا ہوں میں
نبضِ ساقی شبنم آسا، ظرفِ دل دریا طلب — تشنۂ دائم ہوں، آتش زیر پا رکھتا ہوں میں

خلشِ آرزو سے اقبالؒ کی یہ آشفتگی روز بروز بڑھتی گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے سینۂ شعلہ ساماں و آذر فشاں میں جو حشر بپا ہو رہا ہے اسے اپنے ہم جلیس احباب کو کسطرح دکھائے! یہی وجہ تھی کہ وہ بھری محفل میں بھی اپنے آپ کو تنہا پاتا تھا اور یہ تنہائی اسے رہ رہ کر ستاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ

لطف مرنے میں ہے باقی نہ مزہ جینے میں — کچھ مزہ ہے تو اسی خونِ جگر پینے میں
کتنے بیتاب ہیں جوہر میرے آئینے میں — کس قدر جلوے تڑپتے ہیں مرے سینے میں

اس گلستاں میں مگر دیکھنے والے ہی نہیں
داغ جو سینے میں رکھتے ہیں وہ لالے ہی نہیں

اسے تلاش تھی کسی ایسے محرم راز کی جو اس کی سنتا اور اُسے سمجھتا۔ لیکن اسے کہیں ایسا ہمنوا نہیں ملتا تھا حتیٰ کہ وہ اپنی تلاش میں تھک کر کہہ اٹھتا کہ

یہاں کہاں ہم نفس میسّر، یہ دیس نا آشنا ہے اے دل — وہ چیز تو مانگتا ہے مجھ سے کہ زیر چرخِ کہن نہیں ہے

اسے اس تنہائی کا احساس آخر تک رہا۔ اس لئے کہ وہ جس دلیس کی بولی بولتا تھا اسے سمجھنے والا یہاں کوئی نہ تھا۔ اس لئے وہ ہر راہرو سے کہتا کہ

غریبِ شہر ہوں میں، سن تو لے مری فریاد — کہ تیرے سینے میں بھی ہوں قیامتیں آباد
مری نوائے غم آلود ہے متاعِ عزیز — جہاں میں عام نہیں دولتِ دلِ ناشاد
گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے — سمجھتا ہے مری محنت کو محنتِ فرہاد

صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است
خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است

یہ تنہائی بعض اوقات اس قدر شدت اختیار کر جاتی کہ وہ سمجھتا کہ وہ کسی اور دنیا کا انسان ہے جو بھولے بھٹکے یہاں چلا آیا ہے۔ وہ راتوں کی تنہائیوں میں اٹھ اٹھ کر روتا اور خدا سے کہتا کہ

دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر — کہ من شاید نخستیں آدمم از عالمے دیگر

لیکن اس تنہائی کے باوجود، کسی فردوسِ گم گشتہ کی تلاش تھی جو اسے ہر وقت گوشہ بگوشہ لئے لئے پھرتی تھی۔ تلاشِ حقیقت کی یہی خلش بے پایاں تھی جو اسے دانشکدۂ فرنگ میں لے گئی۔ وہاں پہنچ کر ایک اور کشمکش شروع ہو گئی یا یوں کہئے کہ اس کی دیرینہ کش مکش کی نوعیت متعین ہو گئی۔ اقبالؒ کی کیفیت یہ تھی کہ ابتدائی تعلیم و تربیت کے اثر سے ایمان اس کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا تھا۔ اس کے تحت الشعور میں اس کے نقوش بہت گہرے تھے۔ لیکن دماغی طور پر وہ ابھی تک یکسر فلسفی تھا۔ فلسفہ سے اسے شغف بھی خاص تھا۔ مغرب میں پہنچے تو وہاں کے فلاسفر کی

صحبت اور تعلیم نے اس شغف کو اور گہرا کر دیا۔ لیکن اس سے ہوا یہ کہ جو کچھ قلب کی گہرائیوں میں بلا دلیل و برہان جاگزیں تھا فلسفہ اس کی تائید نہیں کرتا تھا اور جو کچھ فلسفیانہ دلائل و براہین سے ثابت ہوتا تھا، اس کی گواہی دل نہیں دیتا تھا۔ دل اور دماغ کی یہی وہ کشمکش تھی جو آگے چل کر مشرق و مغرب کی کش مکش کے نام سے ابھری۔ یہی وہ کشمکش ہے جو اقبالؒ کے سارے پیغام میں مختلف اصطلاحات سے سامنے آتی ہے۔ عقل اور عشق، دل اور دماغ، خرد و جنوں، علم حضور، خبر و نظر، ذکر و فکر، رازی و رومی، ابلیس و جبریلؑ مصطفیٰؐ و بولہب، اہرمن و یزداں یہ سب تقابل درحقیقت ادراک و جذبات کی اسی کشمکش کے مظہر تھے۔ مغرب میں میکانکی تصورِ حیات نے انسان کو ایک پیکرِ آب و گل سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں دی تھی۔ اس تصوّر کی رُو سے زندگی مادی تبدیلیوں سے وجود میں آجاتی تھی اور انہی اجزاء کے پریشان ہو جانے سے اس کا خاتمہ ہو جاتا تھا۔ اس کے برعکس، ایمانی تصوّرِ حیات کی رُو سے حیاتِ انسانی کا سرچشمہ مادہ سے ماوراء تھا اور موت اس کی آخری حد نہیں تھی بلکہ زندگی کی جوئے نغمہ خواں اس کے بعد بھی مسلسل رواں دواں رہتی تھی۔ مغربی سائنس کی رُو سے علم کا دائرہ محسوسات کی چار دیواری تک محدود تھا۔ اس کے برعکس، ایمانیات کی رُو سے علم حقیقی کا سرچشمہ وحی تھا جو سرحدِ ادراک سے ماوراء تھا۔ مغربی معاشرے کی بنیادیں، تنہا عقل پر استوار تھیں جس کا تقاضا ہر فرد کے اپنے مفاد کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کے برعکس، ایمانیات کی رُو سے معاشرہ کی اساس، ان مستقل اقدار پر رکھی جاتی تھی جو تمام نوعِ انسانی کے لئے یکساں طور پر نفع و نقصان اور خیر و شر کی میزان ہوتی ہیں۔ عقل کا تقاضا دوسروں کا سب کچھ چھین کر اپنا آپ بنانا تھا لیکن عشق کا تقاضا، دوسروں کی ربوبیّت سے اپنے نشو و ارتقاء کا سامان بہم پہنچانا تھا۔ عقل، انسانی زندگی کو سمٹا کر، انفرادی دائرہ میں محبوس کر دیتی تھی۔ عشق اسے پھیلا کر ساری دنیا پر محیط کر دیتا تھا۔ عقل خود بین تھی، عشق جہاں بیں۔ عقل من و تو کے امتیاز سے درخت کو شاخوں اور پتوں میں منقسم دیکھتی تھی۔ عشق کو ہر ذرہ میں آفتاب پنہاں نظر آتا تھا۔ عقل محوِ تماشائے لبِ بام رہتی تھی۔ عشق، آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے کا متقاضی تھا۔ عقل، بولہبی حیلہ جوئیاں سکھاتی تھی اور عشق روحِ مصطفویؐ کا پیامبر تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

عقل و عشق کی یہی کشمکش تھی جس نے دانش کدۂ مغرب میں، اقبالؒ کے سینے کو وقفِ اضطراب کر دیا اور اس سے دن کا چین اور رات کا آرام چھین لیا چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و سازِ رومی کبھی پیچ و تابِ رازی

یہی وہ دَور تھا جس کے متعلق وہ بہت بعد میں کہا کرتے تھے کہ

مجھے وہ درسِ فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضورؐ کی لذّت، کہاں حجابِ دلیل

غالب آ جاتا۔ اگر مملکتِ عشق میں عقل کی حکمرانی ہو جاتی۔ اگر فلسفہ کی دلیلیں، ایمان کی بنیادوں کو متزلزل کر دیتیں۔ اگر زندگی کی سوداگرانہ مصلحت کوشیاں متاعِ فقرو قلندری کو خرید لیتیں۔ تو اس کے بعد نہ صرف یہ کہ اقبالؒ، اقبالؒ نہ ہوتا، بلکہ نہ دنیا کے نقشہ پہ پاکستان کا وجود ہوتا اور نہ ہم آپ آج عشق و محبت کے ان جگر سوز افسانوں کو اس طرح دہراتے، نہ ملت اسلامیہ ہندیہ کا اپنا کوئی مستقر و مقام ہوتا اور نہ آج یہاں ایمان و قرآن کے انسانیت ساز تصورات کے چرچے ہوتے۔ اس نازک وقت میں خود اقبالؒ پر کیا گزر رہی تھی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس پر کبھی یہ کیفیات خود وارد ہوئی ہوں۔ جب عقل و حکمت کی فسوں سازیاں اس کے لئے فریبِ نگاہ بننے کی کوشش کرتیں تو عشق و مستی کی رندانہ جرأت فرمائیاں، عروسِ حقیقت کے حسین چہرے سے ذرا نقاب سرکا دیتیں۔ وہ حقیقت کی اس ایک جلمنی جھلک سے، فریبِ عقل سے جھنجھلا کر منہ موڑ لیتا اور اثر و درد میں ڈوبی ہوئی نوائے جگر گداز سے کہتا کہ

الٰہی عقلِ خجستہ پا کو ذرا سی دیوانگی سکھا دے ۔۔۔ اسے ہی سود ائے بخیہ کاری مجھے سر پیرہن نہیں ہے

اور کبھی بیتاب ہو کر دعائیں مانگتا کہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر ۔۔۔ شریکِ زمرۂ لا یحزنوں کر

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں: ۔۔۔ میرے مولا مجھے صاحبِ جنوں کر

مبداءِ فطرت کا یہ انداز عجیب ہے کہ جب تلاشِ حقیقت کی تڑپ و خلش انتہائی شدت اختیار کر لیتی ہے تو حقیقت اپنے چہرے سے خود آپ نقاب اٹھا دیتی ہے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا کہ ووجدك ضالاً فھدی۔ "ہم نے تجھے تلاشِ حقیقت میں سرگرداں پایا تو منزلِ حیات کی طرف راہنمائی کر دی۔" چنانچہ جو شخص بھی تلاشِ حقیقت میں سرگرداں رہتا ہے فطرت کا غیر مرئی ہاتھ اس کی راہنمائی کر دیتا ہے۔ عام انسانوں کی صورت میں یہ راہنمائی سبل (یعنی پگڈنڈیوں) کی طرف ہوتی ہے۔ والذین جاھدو افینا لنھدینھم سبلنا (۲۹/۶۹) لیکن رسول کی راہنمائی صراطِ مستقیم، یعنی زندگی کی متوازن شاہراہ کی طرف ہوتی ہے۔ پگڈنڈیوں پہ چلنے والے اگر اپنا رُخ اس صراطِ مستقیم کی طرف کر لیں جس پر رسولؐ گامزن ہوتا ہے تو ان کی پگڈنڈیاں بھی اسی شاہراہِ حیات سے مل جاتی ہیں، ورنہ ان کا کاروانِ حیات فضائے عقل و خرد کے پیچ و خم میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ جب تلاشِ حقیقت میں قلبِ اقبال تپش و خلش بھی شدت تک پہنچ گئی تو اس فیصلہ کن لمحہ میں مبداءِ فیض کی کرم گستری سے اس کا قدم صحیح راستہ کی طرف اٹھ گیا۔ جب عقل کی شرر انگیزیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر کر کہا کہ اس طلسم پیچ و تاب سے نکلنے کی راہ کون سی ہے تو وہ گھبرا یا۔ لیکن ایک ثانیہ میں اس کا دل پرسوز پکار اٹھا کہ

چارہ ایں است کہ از عشق کشادے طلبیم ۔۔۔ پیشِ او سجدہ گذاریم و مرادے طلبیم

اس جواب سے اقبالؒ[1] کا وہ قلب بیتاب جو اس کشمکش خرد و جنوں سے سراپا اضطراب بن رہا تھا۔ ایمان و یقین کی طمانیت بخش آسودگی سے قرار و سکون کی جنت بن گیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس کی یاد میں وہ اسی کیف و مستی سے پکار اٹھتا تھا کہ

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے ۔۔۔ خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے

جس کا نتیجہ یہ ہے کہ

اب تاثر کے جہاں میں وہ پریشانی نہیں ۔۔۔ اہلِ گلشن پر گراں میری غزل خوانی نہیں
قید میں آیا تو حاصل مجھ کو آزادی ہوئی ۔۔۔ دل کے مٹ جانے سے میرے گھر کی آبادی ہوئی
ضو سے اس خورشید کی اختر مرا تابندہ ہے ۔۔۔ چاندنی جس کے غبارِ راہ سے شرمندہ ہے

یک نظر کردی و آدابِ فنا آموختی
اے خنک روزے کہ خاشاکِ مرا در سوختی

اس سے اقبالؒ کے دل کو کس قدر یکسوئی نصیب ہوگئی اس کی خفیف سی جھلک اس نے اپنی اس نظم میں دکھائی ہے جو "حسن و عشق" کے عنوان سے بانگِ درا میں شامل ہے۔ مضمون کے علاوہ اس نظم میں حسنِ شعریت، تراکیب کی ندرت، تشبیہات کی موزونیت، اور استعارات کی برجستگی دیکھئے اور پھر اندازہ لگائیے کہ ابتدا ہی سے فطرت نے اس حقائق شناس قلب کو اسلوب بیان بھی کس قدر حسین و دلکش عطا فرمایا تھا۔ (یہ ۱۹۰۵ء اور ۱۹۰۸ء کے درمیانی دور کی نظموں میں سے ہے) کہتے ہیں۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتیٔ سیمینِ قمر ۔۔۔ نورِ خورشید کے طوفاں میں ہنگامِ سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل ۔۔۔ چاندنی رات میں مہتاب کا ہم رنگ کنول
جلوۂ طور میں جیسے یدِ بیضائے کلیم ۔۔۔ موجۂ نکہتِ گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیلِ محبت میں یونہی دل میرا

ہے مرے باغِ سخن کے لئے تو بادِ بہار ۔۔۔ میرے بیتاب تخیل کو دیا تو نے قرار
جب سے آباد ترا عشق ہوا سینے میں ۔۔۔ نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینے میں
حسن سے عشق کی فطرت کو ہے تحریکِ کمال ۔۔۔ تجھ سے سرسبز ہوئے میری امیدوں کے نہال

قافلہ ہو گیا آسودۂ منزل میرا

یہ عشق کی پہلی منزل تھی جس میں قرار و سکون ہی مدعائے حیات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ منزل آئی جس میں شورش و حرارت مقصودِ کائنات نظر آتا ہے۔ عشق کی ان بلا انگیز شورشوں میں

---

[1] عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس سے اقبالؒ کا اشارہ کسی اور طرف ہے لیکن جہاں تک میرے مضمون کا تعلق ہے۔ غواص کو مطلب ہے گہر سے، نہ صدف سے۔

وہ لذت تھی کہ اقبالؔ اس حظ وکیف کے لئے قدم قدم پر ھل من مزید کی دعائیں کرتا اور عجب رقص ومستی میں پکار اٹھتا تھا کہ

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر  ہوش وخرد شکار کر، قلب ونظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حسن بھی ہو حجاب میں  یا تو خود آشکار ہو، یا مجھے آشکار کر

جب اقبالؒ کو اس کشمکشِ پیہم سے اس طرح فراغ نصیب ہوگیا تو اس نے عقل وخرد کے اس تمام دفترِ بے معنی پر، جو اپنے آپ کو وجہِ قیامِ کائنات سمجھے ہوئے تھا، ایک تبسم ریز نگاہ ڈالی اور اس سے اپنے مخصوص انداز میں کہہ دیا کہ

تیری متاعِ حیات، علم وہنر کا سرور  میری متاعِ حیات، ایک دلِ ناصبور

فلسفہ نے یہ سنا تو اقبالؔ سے پوچھا کہ ذرا یہ تو بتایئے کہ اس آشفتہ سامانی اور چاک گریبانی کی منطقی توجیہہ کیا ہے؟ اقبالؒ نے ہنس کر کہا کہ

حکیم میری نواؤں کا راز کیا جانے  ورائے عقل ہیں اہلِ جنوں کی تدبیریں

جایئے جایئے طبیعات کی جھاڑیوں نے اس کا دامن الجھایا اور کہا کہ ذرا ٹھہریئے کہ آپ کو آغازِ حیات کا راز بتاؤں۔ اقبالؔ نے سنا اور قلندرانہ استغناء کی شان سے جواب دیا کہ

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے  کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

فلکیات نے کہا کہ میری رصد گاہوں سے فضائے آسمانی کی محیر العقول پنہائیوں اور ان میں تیرنے والے تحیر انگیز کرّوں کا تماشا نظر آسکے گا۔ اُس مردِ دانا نے سنا اور ایک خندۂ زیرِ لبی سے جواب دیا کہ اب یہ لا انتہا وسعتیں میرے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام  اس زمین وآسمان کو لامکاں سمجھا تھا میں

---

اقبالؒ کے سامنے جب مقصودِ حیات اس طرح واضح ہوگیا تو اس نے اپنے لئے مستقبل کا راستہ متعین کر لیا۔ اس کے سامنے عشق کے اس زندگی بخش پیغام کو تمام دنیا کے انسانوں میں عام کرنا تھا۔ یاد رکھئے۔ جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ عشق سے اقبالؒ کی مراد وہ نظامِ ربوبیت تھا جو وحی کی بنیادوں پر استوار ہوتا تھا اور جس کا مقصود نوعِ انسانی کی فطری صلاحیتوں کا کامل نشوو ارتقا تھا۔ یہ نظام تمام انسانیت کے لئے تھا لیکن اس کی ابتداء کسی ایسے خطۂ زمین اور ایسے گروہ سے کی جاسکتی تھی جو اس پیغام کی عملی تشکیل کے لئے اولین خمیر بن سکے۔ اس نے جب اپنی قوم پر نگاہ ڈالی تو اسے یکسر راکھ کا ڈھیر پایا۔ بایں ہمہ، اسے اس راکھ کے ڈھیر کے نیچے سلگتی ہوئی چنگاریاں بھی دکھائی دیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی آتش نوائی سے اس راکھ کے ڈھیر کو شعلۂ جوالہ بنا کر اس سے نوعِ انسانی کے لئے زندگی کی حرارت کا کام لے گا چنانچہ اس نے یورپ ہی سے اپنے رفقاء کو اپنے اس پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ عبدالقادر مرحوم کے نام

اپنے خط میں لکھتے ہیں :-

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور پر　　بزم میں شعلہ نوائی سے اجالا کر دیں
ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط　　اسی ہنگامے سے محفل تہ و بالا کر دیں
اہلِ محفل کو دکھا دیں اثرِ صیقلِ عشق　　سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں　　خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور متعین انداز سے کہ

گئے وہ ایام اب زمانہ نہیں ہے صحرانوردیوں کا　　جہاں میں مانندِ شمعِ سوزاں، میانِ محفل گداز ہو جا
وجود افراد کا مجازی ہے ہستی قوم ہے حقیقی　　فدا ہو ملت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا
یہ ہند کے فرقہ ساز اقبالؔ آذری کر رہے ہیں گویا　　بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

ان آرزوؤں اور دعاؤں۔ ان ولولوں اور تمناؤں کو دل میں لے کر اقبالؔ ہندوستان واپس آیا۔ گیا تو ایک مجموعۂ اضداد تھا۔ واپس آیا تو ہمہ تن یک رنگ ویک آہنگ۔ گیا تو دل میں شکوک و شبہات کی ہزاروں پھانسیں لئے ہوئے۔ آیا تو اسے سکون و طمانیت کی جنت بنائے ہوئے۔ گیا تھا فلسفی بننے کیلئے آیا نوعِ انسانی کے لئے پیامبر بن کر۔ گیا تھا سازِ عقل لے کر، آیا سوزِ عشق خرید کر اور اس متاعِ سوز و سازِ اور سرمایۂ تپش و گداز کو لے کر آیا۔ اس برف آلود سرزمینِ مغرب سے جہاں عشق و ایمان کی رہی سہی چنگاریاں بھی بجھ جایا کرتی ہیں رگیا تھا تو وہ انداز تھا اور واپس آیا تو اس شان سے کہ کیف و مستی کی فضاؤں میں جھوم رہا ہے اور وجد و رقص کے عالم میں گنگنا رہا ہے کہ

کافرِ ہندی ہوں میں، دیکھ میرا ذوق و شوق　　دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود
شوق میری لے میں ہے، شوق میری نے میں ہے　　نغمہ اللہ ہو، میرے رگ و پے میں ہے

لیکن عشق و جنون کی ان وادیوں میں پہنچ کر اقبالؒ نے عقل کو تیاگ نہیں دیا۔ اس لئے کہ عقل و خرد کو تیاگ دینا، قرآن کا پیغام نہیں رہبانیت کا مسلک ہے۔ قرآن کی رُو سے عقل اور وحی کا تعلق ایسا ہی ہے جیسے انسان کی آنکھ اور روشنی کا تعلق ہے جو اپنی آنکھ سے کام نہیں لیتا اس کیلئے روشنی کا عدم و وجود برابر ہے اور آنکھ بغیر روشنی کے بیکار ہے۔ لہٰذا قرآن کا پیغام عقل کو وحی کے تابع رکھنا اور ان دونوں کے امتزاج سے ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنا ہے۔ چنانچہ عقل و عشق، خرد و جنوں، ذکر و فکر، خبر و نظر، علم و حضور کے اس حسین امتزاج کا نام تھا۔ اقبالؒ جس نے کہا کہ

خرد نے مجھ کو عطا کی نظر حکیمانہ　　سکھائی عشق نے مجھ کو حدیثِ رندانہ

اور مشرق و مغرب دونوں کو یہ پیغام دیا کہ

غربیاں را زیرکی سازِ حیات　　شرقیاں را عشق رازِ کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس　　کارِ عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چو با زیرکی ہمبر شود　　نقشبندِ عالمِ دیگر شود

عشق را باز برکے آمیز دہ　　خیز و نقشِ عالمِ دیگر بنہ

مغرب نے تنہا عقل کی ابلہ فریبیوں سے ساری دنیا کو قمار خانہ بنا رکھا تھا۔ مشرق میں ملّا اور صوفی کی کم نگہی نے اسلام جیسے انقلاب در آغوش نظامِ حیات کو بے نتیجہ رسوم کا مجموعہ اور محکومی و ناامیدی کے مسلک گوسفندی کا نقیب قرار دے رکھا تھا۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر مغرب اور مشرق کے ان دونوں تصوّراتِ زندگی کے خلاف جنگ کرنا تھا۔ چونکہ فطرت نے اقبالؒ سے یہ بہت بڑا کام لینا تھا اس لئے اسے اس مقصدِ عظیم کے لئے خاص طور پر تیار کیا گیا۔ "فرشتوں کے نام خدا کے پیغام" میں ہے کہ

آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو　　تہذیبِ نوی کارگہِ فتنہ گری ہے

اور انہی آدابِ جنوں کا اثر تھا کہ اس نے تہذیبِ حاضر کے اس نگاہ فریب طلسم کو توڑ کر رکھ دیا

میری اکسیر نے شیشے کو بخشی سختیِ خارا　　فرنگی شیشہ گر کے فن سے پتھر ہو گئے پانی

لیکن تہذیبِ نو کے اس سیلاب سے کہیں زیادہ ہلاکت انگیز خود اپنے ہاں کے مکتب و خانقاہیت کی تعلیم تھی جس کے خلاف اقبالؒ کو مسلسل جہاد کرنا تھا۔ اس کے لئے اس نے تلاشیانِ حقیقت کو پکار کر کہا کہ

نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے　　مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب

وہ ان سے بار بار کہتا کہ

رہ وہ رسمِ حرم نامحرمانہ　　کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرّک ہے میرا پیراہنِ چاک　　نہیں اہلِ جنوں کا یہ زمانہ

اس نے دیکھا کہ مدعیانِ علمِ شریعت انسانی زندگی کے ابتدائی مسائل تک سے ناواقف ہیں اس لئے ان کے لئے قطعاً ناممکن ہے کہ وہ مقامِ کبریا کو پہچان سکیں۔ اس نے مُلّا سے برملا کہا کہ

تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام　　عجب نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام　　تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال

جب اربابِ شریعت و طریقت کی سطح بیں نگاہیں اس کے حقیقت رس پیغام پر تنقید کرتیں تو وہ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا اور بے نیازانہ کہہ دیتا کہ یہ بیچارے معذور ہیں اس لئے معاف کر دینے کے قابل۔ یہ نہیں جانتے کہ میں کیا کہتا ہوں اور کس مقام سے کہتا ہوں

ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے　　کیا صوفی و ملّا کو خبر میرے جنوں کی

لیکن جاننے والی نگاہیں جانتی تھیں کہ یہ دانندۂ اسرارِ حقیقت کیا کہتا ہے۔ وہ ایک دوسرے سے ملتے اور اعتراف کرتے کہ

ہیں اس کی گفتگو کے انداز محرمانہ　　رازِ حرم سے شاید اقبالؒ باخبر ہے

وہ جانتا تھا کہ ہماری مروّجہ شریعت اور طریقت دونوں کے مستعار تصوّرات اسلام کے عجمی اڈیشن

ہیں جن پر صرف ڈسٹ کور (DUST-COVER) قرآن کا ہے۔ اسے خوب معلوم تھا کہ یہ عجمی نظریاتِ زندگی فکرِ اسلامی کے شجرِ طیب پر اکاس بیل کی طرح مسلّط ہیں۔ جب تک اس اکاس بیل کو الگ نہیں کیا جائے گا، شجرِ ملّت کبھی شگفتہ و شاداب نہیں ہو سکے گا۔ اس لئے وہ پوچھنے والوں سے کہتا کہ

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

ظاہر ہے کہ ایسے انقلاب آفریں پیغام کی ہر طرف سے مخالفت ہوتی تھی۔ لیکن اس نے اس مخالفت کی کوئی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی آتش نوائی کو مسلسل جاری رکھا اور اس طرح رفتہ رفتہ فضائے ملّت اس کی آہِ نیم شبی اور نالۂ سحری سے اثر پذیر ہوتی چلی گئی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر اس نے کہا تھا کہ

میری نوا سے ہوئے زندہ عارف و عامی
دیا ہے میں نے انہیں ذوقِ آتش آشامی

لیکن اس کے باوجود اس کی قوم جس خوابِ گراں میں سو رہی تھی اسے اس سے جگانا کچھ آسان کام نہ تھا۔ ہزار برس سے گاڑی زندگی کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر چلی جا رہی تھی۔ اسے اس مقام سے واپس لا کر پھر سے صحیح لائن پر ڈالنا، آفتابِ مغرب کی طنابیں کھینچ کر اسے سوئے مشرق لانا تھا۔ اسے خدا سے شکایت ہی یہ تھی۔

میں بندۂ ناداں ہوں مگر شکر ہے تیرا
رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

تاثیر یہ ہے میرے نفس کی کہ خزاں میں
مرغانِ سحر خواں مری صحبت میں ہیں خورسند

لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے
جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند

واضح رہے کہ اقبالؒ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ نہیں تھا کہ انگریزوں کی بجائے حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں آ جائے۔ بلکہ یہ کہ اس خطۂ زمین کے مسلمان، انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی بجائے، ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اسی مقصد کے لئے اس نے ملّتِ اسلامیہ کو پاکستان کا تصوّر دیا تھا۔ لیکن قوم نے اس وقت اس تصوّر کو ایک شاعر کا افسانوی تخیّل سمجھ کر اس پر غور و فکر کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔ ایک طرف اپنی قوم کا یہ عالم تھا اور دوسری طرف مخالف قوتیں برق رفتاری کے ساتھ چاروں طرف سے ہجوم کرکے امنڈے چلی آ رہی تھیں۔ حالات ایسے نامساعد تھے لیکن بایں ہمہ، وہ اس سیلاب بلا انگیز میں روشنی کے مینار کی طرح کھڑا تھا کہ زمانہ کی تلاطم انگیز موجیں آئیں اور اپنا سر پھوڑ کر واپس چلی جائیں۔ یہی تھے وہ حالات جن کے متعلق اس نے کہا تھا کہ

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

ان ناموافق حالات میں ہر ہانِ سست عناصر اسے مایوسیوں کے چھلاوے سے ڈراتے اور ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے کہ

ہر نفس اقبال تیرا آہ میں مستور ہے — سینۂ سوزاں ترا فریاد سے معمور ہے
قصۂ گل، ہم نوایانِ چمن سنتے نہیں — اہلِ محفل تیرا پیغام کہن سنتے نہیں
زندہ پھر وہ محفلِ دیرینہ ہو سکتی نہیں — شمع سے روشن شبِ دوشینہ ہو سکتی نہیں

تو اس کا چہرہ تمتما اٹھتا، پیشانی جوشِ حمیت سے شفق آلود ہو جاتی۔ وہ امیدوں کی ایک دنیا اپنے جلو میں لئے اٹھتا اور حزم و یقین کی پوری قوتوں سے کہتا کہ

ہم نشیں! مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں — اس صداقت پر ازل سے شاہدِ عادل ہوں میں
نبضِ موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے — اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کیلئے پیدا کیا — اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
میری ہستی، پیرہن عریانیٔ عالم کی ہے — میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے — ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
ہاں یہ سچ ہے، چشم بر عہد کہن رہتا ہوں میں — اہلِ محفل سے پرانی داستاں کہتا ہوں میں
یادِ عہد رفتہ میری خاک کو اکسیر ہے — میرا ماضی میرے استقبال کی تفسیر ہے

سامنے رکھتا ہوں اس دورِ نشاط افزا کو میں
دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

وہ جانتا تھا کہ نا امیدیوں کے چھلاوے سے ڈرلنے والے وہ ہیں کہ مدت ہائے دراز سے تقلید اور بے عملی کے حیات سوز اثرات ان کی ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر چکے ہیں اور وہ اپنی زندگی میں خفیف سی تبدیلی کے تصور تک سے گھبرا اٹھتے ہیں۔ وہ اِن پیرانِ کہن سے کوئی توقع نہیں رکھتا تھا، اس لئے وہ اپنے پیغام کا حقیقی مخاطب ان نوجوانوں کو سمجھتا تھا جن کے قلب و نگاہ کی تبدیلی، قوموں کی تقدیریں بدل دیا کرتی ہے۔ انہی کو وہ اپنی متاعِ سوز و گداز کا وارث سمجھتا اور انہی کے لئے راتوں کو اٹھ اٹھ کر دعائیں مانگا کرتا تھا کہ

شرابِ کہن پھر پلا ساقیا — وہی جام گردش میں لا ساقیا
خرد کو غلامی سے آزاد کر — جوانوں کو پیروں کا استاد کر
تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے — دلِ مرتضیٰؓ، سوزِ صدیقؓ دے
ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر — زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے — مرا عشق میری نظر بخش دے
میرے دیدۂ تر کی بے خوابیاں — مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
میرے نالۂ نیم شب کا نیاز — مری خلوت و انجمن کا گداز
امنگیں مری، آرزوئیں مری — امیدیں مری جستجو ہیں مری
یہی کچھ ہے ساقی متاعِ فقیر — اسی سے فقیری میں ہوں میں امیر

مرے قافلے میں لٹا دے اسے
لٹا دے ٹھکانے لگا دے اسے

ملت کے مستقبل کا یہی غم پنہاں تھا جس نے اقبالؒ پر راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔ علی بخش[1] کا بیان ہے کہ جن دنوں آپ کی طبیعت زیادہ خراب تھی، ایک رات، پچھلے پہر، میں نے سنا کہ پلنگ سے سسکیوں کی آواز آرہی ہے۔ چپکے سے قریب گیا تو دیکھا کہ آپ تکیہ پر کہنیاں ٹیکے دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھے ہیں اور زار و قطار رو رہے ہیں۔ رو رہے اور گنگنا رہے ہیں کہ

مجھے آہ و فغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا		تھم اے رہرو! کہ پھر شاید کوئی مشکل مقام آیا

اس غزل کے دو شعر اور بھی سنیے۔ فرماتے ہیں۔

ذرا تقدیر کی گہرائیوں میں ڈوب جا تو بھی		کہ اس جنگاہ سے میں بن کے تیغ بے نیام آیا
چل اے میری غریبی کا تماشا دیکھنے والے		وہ محفل اُٹھ گئی جس دم کہ مجھ تک دورِ جام آیا

علی الصباح حسبِ معمول حکیم صاحب آئے۔ دیکھا تو رنگ معمول سے زیادہ زرد ہے اور چہرہ پہلے سے زیادہ افسردہ۔ آنکھیں سوج رہی ہیں اور کمزوری بڑھ گئی ہے۔ کیفیت مزاج کا پوچھا تو آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور بمشکل اتنا کہہ سکے کہ

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لئے مئے حیات		کہنہ ہے بزمِ کائنات تازہ ہیں میرے واردات

حکیم صاحب نے ہلکے سے تبسم سے کہا کہ آپ تو دنیا بھر کے مسائل کا حل دوسروں کو بتاتے رہتے ہیں۔ اپنی مشکل کا حل کیوں نہیں تلاش کر پاتے! انھوں نے بھی اسی انداز کے تبسم زیرلبی سے فرمایا کہ کیا کہوں!

مقام ہوش سے آساں گزر گیا اقبالؔ		مقام شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ

حکیم صاحب نے پوچھا کہ بالآخر وہ کونسی بات ہے جس کا غم آپ کو اس طرح نڈھال کئے جا رہا ہے۔ کہا کہ حکیم صاحب! آپ دیکھتے نہیں کہ

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق		خلوتیانِ میکدہ، کم طلب و تہی کدو
میں کہ میری غزل میں ہے آتشِ رفتہ کا سراغ		میری تمام سرگذشت، کھوئے ہوؤں کی جستجو

حکیم صاحب نے کہا کہ آپ کا مرض زیادہ تشویش انگیز ہوتا جا رہا ہے۔ آپ کو، کچھ دنوں کے لئے ان تفکرات کو چھوڑنا ہوگا۔ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا کہ حکیم صاحب! میں جانتا ہوں کہ

پھونک ڈالا ہے مری آتش نوائی نے مجھے

لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

اور میری زندگانی کا یہی ساماں بھی ہے

---

[1] اقبالؒ کا فدائی جو دنیا میں عام طور پر اقبالؒ کے ملازم کی حیثیت سے متعارف ہے لیکن جو درحقیقت اقبالؒ کا عاشق تھا اور اس عشق کو آج تک زندہ رکھے ہوئے ہے۔

اتنے میں ڈاک آ گئی۔ دیکھا تو اس میں ایک خط ایک ایسے فلسفہ زدہ نوجوان کا تھا جس کے والد سے آپ کے دیرینہ مراسم تھے۔ اس نے جیسا کہ فلسفہ کے ابتدائی مراحل میں اکثر ہوتا ہے جب کہ طالب علم کے افکار میں ہنوز پختگی نہیں آتی، نفس انسانی، وحی، حیات بعد الممات، مستقل اقدار وغیرہ تصورات پر نہایت طنز آمیز اعتراضات کئے تھے۔ آپ نے خط پڑھ کر پنسل اٹھائی اور اسی کی پشت پر لکھ دیا کہ

ہیں اصل کا خاص سومناتی    آبا میرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد    میری کف خاک برہمن زاد
ہے فلسفہ میرے آب و گل میں    پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے    اس کی رگ رگ سے باخبر ہے
شعلہ ہے ترے جنوں کا بے سوز    سن مجھ سے یہ نکتۂ دل افروز
افکار کے نغمہ ہائے بے صوت    ہیں ذوقِ طلب کے واسطے موت
دیں مسلکِ زندگی کی تقویم    دیں سرِ محمدؐ و ابراہیم
دل در سخنِ محمدی بند    اے پورِ علیؓ، ز بو علی چند

ابھی اس خط کا جواب ختم نہیں ہونے پایا تھا کہ لاہور کے ایک مشہور روزنامہ کے مدیر جن کا شمار آپ کے حلقۂ ارادتمنداں میں ہوتا تھا، اندر آ گئے۔ خیریتِ مزاج کے بعد کہا کہ آپ نے دیکھا ہے کہ آپ کے حالیہ بیان پر فلاں اخبار کے ایڈیٹر نے کیسے رکیک حملے کئے ہیں۔ آپ مسکرائے اور کہا کہ میں نے دیکھا تو نہیں۔ کل شام فلاں صاحب سے سنا ضرور تھا۔ انہوں نے جھجکتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ کوئی جواب لکھیں گے، آپ نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا اور کہا، کہ بھائی! میں ان جھمیلوں میں کبھی نہیں الجھتا؟ آپ مجھے جانتے ہیں کہ

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی    گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند
کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق    نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش    میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند
ہوں آتشِ نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش    میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند
پرسوز و نظرباز و نکوبین و کم آزار!    آزاد و گرفتار و تہی کیسہ و خورسند
ہر حال میں میرا دلِ بے قید ہے خرم    کیا چھینے گا غنچے سے کوئی ذوقِ شکرخند

حتیٰ کہ میرا تو یہ عالم ہے کہ

چپ رہ نہ سکا حضرتِ یزداں میں بھی اقبالؒ    کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

مدیر صاحب نے کہا کہ درحقیقت یہ ایک سازش ہے دو قوموں کے اس نظریہ کے خلاف جس کا تصور آپ نے پیش کیا ہے اور جس کی رو سے مسلمانانِ ہند کو اپنے مستقبل کے لئے ایک واضح اور درخشندہ نصب العین مل گیا ہے۔ آپ نے پھر مسکرا کر فرمایا کہ سازش ہے تو ہوا کرے مجھے اس کی کیا

رہے ہیں اور ہیں فرعون میری گھات میں اب تک　　مگر کیا غم کہ میری آستیں میں ہے یدِ بیضا

بعد سہ پہر، حسبِ معمول، پھر ملنے والوں کا اجتماع ہوا اور دنیا بھر کے مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ ایک صاحب نے کہا کہ (مولانا) حسین احمد مدنی نے آپ کے اشعار کے جواب میں جو بیان دیا ہے وہ آپ کی نظروں سے گذرا! فرمایا کہ ہاں میں نے دیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ مولوی صاحب نے قوم اور ملت* کے متعلق جو لفظی بحث چھیڑی ہے آپ اس کا کچھ جواب دیں گے؟ فرمایا کہ

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا　　فقیہہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا
حدیثِ بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو　　نہ کر خاراشگافوں سے تقاضا شیشہ سازی کا

پھر حقہ کا کش لگایا اور مسکراتے ہوئے فرمایا

کہاں سے تو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی　　کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

آپ کے حلقۂ احباب میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جنہیں ہمیشہ اس بات کا قلق رہتا کہ نالائق اور جاہل لوگ بڑے بڑے مناصب و مدارج حاصل کئے جاتے ہیں اور آپ ہیں کہ جن کی قابلیت کا سکہ ساری دنیا مان رہی ہے لیکن اس طرح ایک گوشے میں پڑے ہیں۔ وہ آتے اور آپ سے کہتے کہ فلاں اسامی خالی ہو رہی ہے۔ آپ اپنی آمادگی ظاہر کر دیجئے، فوراً کامیابی ہو جائے گی۔ آپ ان مخلص بہی خواہوں کی سادگی پر مسکراتے اور جی ہی جی میں کہتے کہ میں انہیں کس طرح بتاؤں کہ مبداء فیض کی عنایاتِ خسروانہ نے مجھے کیا عطا کیا ہے اور یہ مجھے کسطرف بلا رہے ہیں۔ وہ زیادہ اصرار کرتے تو آپ ان سے کہتے کہ

فطرت نے نہ بخشا مجھے اندیشۂ چالاک　　رکھتی ہے مگر طاقتِ پرواز مری خاک
وہ خاک کہ ہے جس کا جنوں صیقلِ ادراک　　وہ خاک کہ جبریل کی ہے جس سے قبا چاک
وہ خاک کہ پروائے نشیمن نہیں رکھتی　　چنتی نہیں پہنائے چمن سے خس و خاشاک
اس خاک کو اللہ نے بخشے ہیں وہ آنسو　　کرتی ہے چمک جن کی ستاروں کو عرقناک

جاوید سے آپ کو بہت محبت تھی۔ وہ ابھی بچہ ہی تھا لیکن اس سے آپ بڑے کام کی باتیں کرتے تھے۔ ایک دن اس نے پوچھا کہ ابا جان آپ کے پاس نہ اچھے اچھے کپڑے ہیں، نہ قیمتی صوفے اور قالین ہیں۔ نہ بہت سے نوکر چاکر ہیں، نہ موٹر ہی ہے۔ لیکن آپ کے پاس بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ یہ آپ کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں؟ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ بیٹا!

ہے میری بساط کیا جہاں میں　　بس ایک فغانِ زیر بامی
اک صدق مقال ہے کہ جس سے　　میں چشمِ جہاں میں ہوں گرامی

جب آپ لندن گئے ہیں تو جاوید نے پہلا خط اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا۔ اس کے جواب میں آپ نے اسے لکھا کہ

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر　　نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
میں شاخِ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر
مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

زمانہ آگے بڑھتا گیا اور اس کے ساتھ ہی اقبالؒ کے پیغام کی تندی اور تیزی بھی شدت اختیار کرتی چلی گئی۔ اس کی نگہ بصیرت دیکھ رہی تھی کہ دنیا میں کیا ہونے والا ہے اور اس کی بساطِ سیاست پر مسلمان کس طرح پٹ رہا ہے۔ اس آنے والے انقلاب کے تصور سے جوں جوں اس کا احساس شدید ہوتا جاتا اس کی نوا کی تلخی بھی تیز ہوتی جاتی۔ اقبالؒ کے پیشِ نظر پوری انسانیت کے اندر ایک ایسا انقلاب برپا کرنا تھا جس سے یہ زمین بدل جائے، یہ آسمان بدل جائے اور خاکِ آدم کو وہ نمود حاصل ہو جس کے لئے اسے اس طرح سنوارا گیا تھا۔ انقلاب آفرینی کا یہی وہ جذبہ تھا جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا ہے کہ

حضورِ حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت کر نہ دے پیدا
ندا آئی کہ آشوبِ قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا

دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی
گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی
خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی
رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی
سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے
آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی

ادھر آسمان پر تو یہ باتیں ہو رہی تھیں لیکن ادھر زمین والے ہنوز یہی طے نہیں کر پائے تھے کہ اقبالؒ جو کچھ کہتا ہے اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ کوئی کہتا کہ اس کے کلام میں سوز و گداز اور کیف و مستی کے تذکرے ان نقوش کے اثرات کا نتیجہ ہیں جو بچپن کی مشرقی تعلیم اور تصوف آمیز ماحول نے اس کے تحت الشعور میں مرتسم کر رکھے ہیں۔ کوئی کہتا کہ اس کی فکر، نیٹشے، برگساں، الیگزینڈر، وارڈ، جیمز، جیسے مغربی مفکرین کے فلسفہ کی رہینِ منت ہے۔ اقبالؒ یہ سب کچھ سنتا اور ان سادہ لوح معترضین سے کہتا کہ جب تم اس منبعِ علم و یقین سے آشنا نہیں ہو جو میری فکر کا سرچشمہ ہے تو اس باب میں قیاس آرائیاں کیوں کرتے ہو؟ میری فکر نہ مشرقی مکتب و خانقاہ سے متاثر ہے نہ مغربی حکمت و فلسفہ کی منت پذیر۔

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض میری
یہ دل کی موت وہ اندیشہ و نظر کا فساد

میں نے مشرق و مغرب دونوں کے علوم و فنون کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں مجھے حقیقت کا کہیں سراغ نہیں ملا۔

بہت دیکھے ہیں میں نے مشرق و مغرب کے میخانے
یہاں ساقی نہیں پیدا وہاں بے ذوق ہے صہبا

میری فکر کسی سے بھی متاثر نہیں رہی۔ میں نے کسی چیز کو تقلیداً دیکھا ہی نہیں بلکہ ہر شے کو ازخود پرکھا ہے اور اپنے نتائج آپ مستنبط کئے ہیں۔

میانِ آب و گل خلوت گزیدم	زافلاطون و فارابی بریدم
نکردم از کسے دریوزۂ چشم	جہاں را جز بہ چشمِ خود نہ دیدم

یہی میرا مسلک ہے جس سے اب کیفیت یہ پیدا ہو چکی ہے کہ لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی حقیقت، میری نگۂ تجسس کے ازخود بے نقاب ہو جاتی ہے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ

اقبالؔ نے کل اہلِ خیاباں کو سنایا	یہ شعر نشاط آور و پرسوز و طربناک
میں صورتِ گل دستِ صبا کا نہیں محتاج	کرتا ہے میرا جوشِ جنوں میری قبا چاک

یہی وہ حقیقت کشائی ہے جس سے میری ذیدہ دری کا یہ عالم ہے کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے	عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

چنانچہ وہ جہانِ فردا جس کے انتظار میں آسمان کے تاروں کی آنکھیں ایک مدت سے محرومِ خواب ہیں، میرا پیام اس کے لئے طائر پیش رس ہے،

عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں	میری نواؤں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

لہٰذا اس عالمِ ہست وبود کی حقیقت صرف اس پر کھل سکتی ہے جس کی سمجھ میں میرا پیغام آجائے۔

نظر آئے گا اسی کو یہ جہانِ دوش و فردا	جسے آگئی میسر مری شوخئ نظارا

لوگ سمجھتے ہیں کہ اقبالؒ، جاوید منزل میں پلنگ پر لیٹے لیٹے حقہ پیتا رہتا ہے اور شاعری کرتا رہتا۔ انہیں کیا معلوم کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

مرے ہم صفیر اسے بھی اثر بہار سمجھے	انھیں کیا خبر کہ کیا ہے یہ نوائے عاشقانہ

یہ شاعری نہیں ہے۔ نہ ہی شاعری کسی پیغام بر کے شایانِ شان ہوتی ہے۔ جس کے سامنے زندگی کا نصب العین متعین ہو، اس کا ہر قدم اُسی نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہو، اور اس لئے وہ ہر مخاطب کو اسی منزل کی طرف لے جا رہا ہو، اسے شاعری سے کیا واسطہ!

میری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ	کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

یہ وہی "رازِ درونِ میخانہ" تھے جن کے متعلق میں نے زبورِ عجم میں کہا ہے کہ

زبرونِ درگذشتم، ز درونِ خانہ گویم	سخنے نگفتۂ را چہ قلندرانہ گفتم

تم اسے شاعری سمجھتے ہو اور میں شاعری کو اپنے خلاف تہمت خیال کرتا ہوں۔

نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم	مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست	کہ برما تہمتِ شعر و سخن بست

تم اسے حسن وشباب کے رنگین افسانے سمجھتے ہو؟ تم اسے عہدِ کہن کی خواب آور داستانیں تصور کرتے ہو؟ تم بھی سمجھے بیٹھے ہو کہ یہ گل و بلبل کی فرضی کہانیاں ہیں؟ تمہارا اندازہ بھی ہے کہ

یہ ایک شاعر کی دنیائے تصورات کی پریشان خیالیاں ہیں؟ اگر تمہارا یہی اندازہ ہے تو کس قدر غلط ہے، تمہارا یہ اندازہ؟ اگر تمہارا یہی خیال ہے تو کس قدر باطل ہے تمہارا یہ خیال!! اگر تم جاننا چاہتے ہو کہ جو کچھ میں کہتا ہوں وہ درحقیقت ہے کیا، تم آؤ! میرے مئے سخن کے پیالے میں جھانک کر دیکھو اس میں کیا نظر آتا ہے؟

دو عالم را تواں دیدن بہ مینائے کہ من دارم ۔۔۔ کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
اگر دیوانۂ آید کہ در شہر افگند ہُوئے ۔۔۔ دو صد ہنگامہ برخیزد ز سودائے کہ من دارم
مخور ناداں غم از تاریکیٔ شبہا کہ می آید ۔۔۔ کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم
ندیمِ خویش می سازی مرا، لیکن ازاں ترسم ۔۔۔ نداری تابِ آں آشوب و غوغائے کہ من دارم

سننے والے یہ سب کچھ سنتے لیکن ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آتا تھا کہ اگر یہ خیالات نہ فکرِ مغرب سے مستعار لئے ہیں نہ تصوراتِ مشرق سے، نہ یہ مکتب کی زلہ چینی ہے نہ خانقاہ کی دریوزہ گری۔ نہ یہ شاعری ہے نہ افسانہ طرازی۔ تو پھر بالآخر ان تصوراتِ حیات کا سرچشمہ کیا ہے؟ وہ مردِ خود آگاہ و خدامست یہ کچھ سنتا اور کہتا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں کہ میرے انقلاب بر دوش پیغام کا سرچشمہ کیا ہے۔ اس کا سرچشمہ ہے۔

آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم ۔۔۔ حکمتِ او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات ۔۔۔ بے ثبات از قوتش گیرد ثبات

میں نے عمر بھر اسی شمع عالم تاب سے اکتسابِ ضیا کیا ہے، اسی یمِ ناپیدا کنار سے حکمت کے موتی نکالے ہیں۔

گوہرِ دریائے قرآں سفتہ ام ۔۔۔ شرحِ رمزِ صبغۃ اللہ گفتہ ام

اس لئے

از تب و تابم نصیبِ خود بگیر ۔۔۔ بعد ازیں ناید چو من مردِ فقیر

لیکن سننے والے کہتے کہ اس قرآن کو تو ہم ہر روز پڑھتے ہیں۔ اس کی تفسیریں بھی دیکھتے ہیں۔ ہمیں تو اس میں یہ کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ دانائے راز، ان سادہ لوحوں کی یہ باتیں سنتا اور کہتا کہ قرآن اپنے آپ کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کرتا۔ اس کے سمجھنے کے انداز کچھ اور ہی ہیں۔

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب ۔۔۔ گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

اس لئے ؎

چو مسلماناں اگر داری جگر ۔۔۔ در ضمیرِ خویش و در قرآں نگر

---

برادران! یہ ہے وہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ جس نے کہا تھا کہ

چو رخت خویش بربستم ازیں خاک ہمہ گفتند باما آشنا بود
ولیکن کس ندانست ایں مسافر چہ گفت و باکہ گفت و از کجا بود

میں نے بھی اسی اقبالؒ کی تلاش میں ساری عمر گذار دی۔ اسے مختلف وادیوں اور متنوع شاہراہوں میں ڈھونڈتا رہا۔ لیکن آخرالامر قرآن ہی سے اس کی راہ اور منزل کا سراغ پایا۔

اسی اقبالؒ کی میں جستجو کرتا رہا برسوں بڑی مدت کے بعد آخر بہ شاہیں زیر دام آیا

---


# ابلیس و آدم

پرویز صاحب نے جب سلسلۂ معارف القرآن شروع کیا تو من و یزداں (اللہ) کے بعد دوسری جلد **ابلیس و آدم** کے عنوان سے شائع کی تھی۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا تھا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۷۲ء میں۔ اس کے بعد یہ کتاب کمیاب تھی، اس لئے اس کا چوتھا ایڈیشن شائع کرنا پڑا

کتاب کے مشمولات سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

۱۔ انسان کی تخلیق۔ ۲۔ نظریۂ ارتقا۔
۳۔ قصہ آدم۔ ۴۔ ابلیس۔
۵۔ شیطان۔ ۶۔ جنات۔
۷۔ ملائکہ۔ ۸۔ روح (نفس)
۹۔ وحی (کشف و الہام)۔ ۱۰۔ نبوت اور رسالت۔
۱۱۔ کیا تمام مذاہب سچے ہیں؟

کتاب دستیاب بہترین سفید کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ بڑی تقطیع ضخامت پونے چار سو صفحات۔ جلد مضبوط خوبصورت مزین اور مطلا قیمت فی جلد -/۷۵ روپے علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ ادارہ طلوع اسلام ۲۵۔ بی، گلبرگ ۲، لاہور

# اقبالؒ کا فلسفۂ زندگی

حکیم الامت علامہ اقبالؒ کا مفکرانہ کلام ہمیں قدم قدم پر دعوتِ غور و فکر دیتا ہے اور حیات و کائنات ارضی و سماوی کے رازِ سربستہ کھولتا چلا جاتا ہے فرماتے ہیں ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید — کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

یہ شعر ہمیں نظام کائنات میں انسان کے کارِ منصبی کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ کائنات کی بیئت کو اقبالؒ قرآن کریم کی روشنی میں متعین کرتے ہیں۔ جس کا اعلان یہ ہے

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ یہ دنیا خالقِ حقیقی نے کھیل یا تماشے کی خاطر تخلیق نہیں کی۔ بلکہ یہ کائنات ایک حقیقت ہے۔ فرمانِ ربّی ہے۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ؕ

دنیا کی پیدائش ایک مقصد رکھتی ہے۔ یہ اپنی وسعتوں اور تنگیوں کے باوصف سعیٔ انسانی کے لئے ایک وسیع میدان ہے۔ اقبالؒ کا کہنا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید

یعنی اس کی راہ پہلے سے ہی متعین نہیں کر دی گئی بلکہ اس کو ناتمام حالت میں پیدا کیا گیا ہے اور یہ کہ ؎

آ رہی دمادم صدائے کن فیکون۔ یعنی اس کی آرائش کے لئے ارتقا کی درجہ بدرجہ بیحد گنجائش ہے۔ اس کی ہر منزل پر تخلیق کی نئی صورت مضمر ہے۔ یہ شعر اسی حقیقت کو واضح کر رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اپنے ابتدائی مدارج سے آج کی موجودہ شکل تک انسان کی قوت تخلیق نے ہی اس دنیا کو سنوارا ہے اور انسانی ہاتھ نے ہی اس میں خوبصورتی، ترتیب، نظم اور منقبت کے امکانات پیدا کئے ہیں۔ اسی کے پیش نظر اقبالؒ نے انسانی کوششوں کو خدا تعالےٰ کے حضور اس طرح سراہا ہے۔ ؎

| | |
|---|---|
| تو شب آفریدی۔ چراغ آفریدم | سفال آفریدی، ایاغ آفریدم |
| بیابان وکہسار و راغ آفریدی | خیابان و گلزار و باغ آفریدم |
| من آنم کہ از سنگِ آئینہ سازم | من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم |

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی نا تمام کیفیت یعنی اس کی نامکمّل صورت ہی انسان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کرتی ہے۔ وہ اپنے فکر اور تخیّل کی آزادی کی وجہ سے دوسری مخلوق سے اشرف ہے۔ وہ اپنے ذہن میں ان ناہمواریوں کو محسوس کرتا ہے۔ ان کی وجوہ کو دریافت کرنے کی جستجو کے لئے اس کی فطرت اس کو اکساتی ہے۔ وہ ان ناہمواریوں کو دُور کرنے کی راہ سوچتا ہے اور روحِ انسانی کی اپنی صلاحیتوں کے باعث آدم کی تخلیق سے فرشتوں کی دنیا میں تہلکہ پڑ جاتا ہے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور — خودگرے خودشکنے خودنگرے پیدا شد
خبرے رفت زگردوں بہ شبستانِ ازل — حذر اے پردگیاں پردہ درے پیدا شد
آرزو بے خبر از خویش بآغوشِ حیات — چشم وا کرد و جہانِ دگرے پیدا شد

ترجمانِ حقیقت اقبالؒ نے تخلیقِ آدم کا ان خوبصورت اشعار میں کیا حقیقی نقشہ کھینچا ہے!
پھر روحِ ارضی آدم کا استقبال کرتے ہوئے کہتی ہے ؎

ہیں تیرے تصرّف میں یہ بادل یہ گھٹائیں — یہ گنبدِ افلاک یہ خاموش فضائیں
یہ کوہ یہ صحرا یہ سمندر یہ ہوائیں — تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں
آئینۂ ایّام میں آج اپنی ادا دیکھ!

اپنی بالغ نظری اور قوتِ تخلیق کے باعث انسان میں وقت اور کائنات پر فتح حاصل کرنے کی صلاحیّت ہے۔ اور نا تمام دنیا کی تعمیر و تکمیل میں انسان باری تعالیٰ کے ساتھ شریکِ کار بن جاتا ہے۔ یوں وہ ہر گام ہر منزل پر طرحِ نَو کی بنا ڈالتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں — کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

آگے بڑھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عملی دنیا میں اقبالؒ کے نقطۂ نظر کی وضاحت اس کے فلسفۂ کی روشنی میں کی جائے۔ بعض اہلِ علم یہ سوچ رکھتے ہیں کہ شاعری دیگر فنونِ لطیفہ کی طرح کسی مخصوص پیغام کی حامل نہیں ہوتی۔ بلکہ محض شاعر کے افکار کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مگر اقبالؒ کے نزدیک یہ بات صحیح نہیں۔ ان کی صائب رائے یہ ہے کہ فنونِ لطیفہ بالخصوص شاعری کی اہمیّت ہی اس بات میں ہے کہ وہ زندگی پر منطبق ہو۔ اس کی غایت سمجھنے میں ممد ہو۔ اس کے بنیادی مقاصد کی وضاحت کرے اور عمل کی دنیا میں حرکت میں تیزی پیدا کرے۔ وہ فن برائے فن کے نظریہ سے متفق نہیں۔ وہ فن برائے زندگی کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں ؎

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا؟
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا؟
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا؟

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں      جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا؟

اقبالؒ اس لحاظ سے غزل گو نہ تھے کہ جذبات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر مطمئن ہو جاتے۔ وہ اوّل و آخر ایک عظیم مفکر تھے۔ ایسے مفکر کہ جن کو ظنّی قیاسی الجھنوں میں پڑنا مطلوب نہ تھا وہ اپنی صلاحیتوں کو زندگی کے حقائق سمجھنے اور مسائلِ حیات سلجھانے میں مصروف رکھتے تھے۔ ان کے کلام کی صوری خوبیوں کے اعتراف سے زیادہ اُس کی معنوی خوبیوں کی قدر اور فہم ضروری ہے۔ ان کے فکر کی عمارت فلسفۂ خودی کی بنیاد پر تعمیر ہوئی ہے۔

اقبالؒ جن کی نظر ہمہ وقت روحِ انسانیت کی ترقیوں اور وسعتوں پر تھی۔ انہوں نے خودی کی اہمیت کو ہر ممکن طریق پر واضح کیا ہے۔ ان کا فرمانا ہے کہ زورِ خودی صرف روحِ انسانی میں ہی نمایاں نہیں بلکہ ہر زندہ شے میں موجود ہے۔ اور سب زندہ اجسام کی خودی زیادہ بہتر قالب میں ڈھلنے کی سعی کرتی ہے اور یہ کہ انسانی شخصیت زورِ خودی کی ارفع ترین شکل ہے۔ ؎

ہر چیز ہے محوِ خود نمائی، ہر ذرہ شہیدِ کبریائی      بے ذوقِ نمود زندگی موت تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت پربت ضعفِ خودی سے رائی      اک تو ہے کہ حق ہے اس جہاں میں باقی ہے نمودِ سیمیائی

ارتقا کی کسوٹی ہی یہ ہے کہ اس کی شخصیت کتنی منزلیں طے کر چکی ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خودی کی ارتقا کیسے ہو؟ اقبالؒ کا جواب یہ ہے کہ اس میں مضمر لامحدود تخلیقی امکانات کا شعور پیدا کر کے اس کو ترقی کی راہ دکھلائی جا سکتی ہے۔ روحِ انسانی پہلی خودی کی وجہ سے خودنمائی چاہتی ہے۔ اسی وجہ سے ہر قدم اور ہر منزل پر اپنی ہستی کا جداگانہ وجود چاہتی ہے۔ اس کا منشاء یہ نہیں کہ خالق کے نور میں محض مدغم ہو کر رہ جائے۔ روحِ انسانی کی جداگانہ حیثیت خود قرآن کریم میں متعین کی گئی ہے۔ انسان اپنا ایک وجود رکھتا ہے۔ اس کے وجود کی طرح اس کی راہ بھی علیٰحدہ ہے۔ اور اس کا مفہوم بھی قسّامِ ازل نے علیٰحدہ ہی مقرر کیا ہے۔ اس کی روح جب شانِ کریمی کے حضور وارد ہو گی تو مدغم ہونے کو نہیں۔ بلکہ پلٹ کر اپنے اعمال کے مرتّب کردہ نتائج کو پرکھنے کے لئے۔ اسی وجہ سے اس دنیا میں وہ اپنے عمل کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کرنا چاہے گی۔ تاکہ جب معبودِ ازل کے حضور جائے تو اپنی ارفع ترین شکل میں ہو۔

خودی ایک نقطۂ آغاز نہیں۔ بلکہ داخلی اور خارجی سرکشی اور طاغوتی قوتوں کے خلاف ایک مسلسل جانفشانہ عمل کا ثمر اور ماحصل ہے۔ گویا خودی کا ارتقا ایک تخلیقی عمل ہے جو مسلسل اپنے عمل یا ردِّ عمل سے اثر انداز ہوتا ہے۔ کسی فرد کے اپنے آپ کو ایک ساکن ماحول کے مطابق ڈھال لینے سے خودی کا ارتقا نہیں ہوتا۔ خودی کے ارتقا کو اپنی ذات کی نشوونما اور شخصیت کی نمود کے عملِ پیہم کے مترادف سمجھنا چاہیئے۔ انسانی ذات کی صحیح اٹھان کے لئے فکر و آزادی کا ماحول جزوِ لازمی ہے بصورتِ دیگر ذہنِ انسانی میں غلامانہ ذہنیت پیدا ہو جاتی ہے۔ قوتِ تخلیق اور اپنے ذہن سے کام لینے کی اہلیت دب جاتی ہے۔ نقالی کا جذبہ ابھر آتا ہے۔ مغلوب و غالب کے درمیان احساسِ کمتری

اور جذبۂ برتری کا بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ فرد کی خوابیدہ صلاحیتیں آزادی کے ماحول میں ہی ابھر اور نکھر سکتی ہیں۔ قوتِ تخلیق جو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے سب سے اعلیٰ وارفع ہے، کشش اور جدت پسندی جو ترقی اور نئے تجربات کی محرک ہوتی ہے۔ ان سب کو محکم و مضبوط کرنے کے لئے آزادی کا ماحول ناگزیر ہے۔ آزادی اور غلامی کے ماحول کا فرق اقبالؒ نے یوں بیان کیا ہے۔

نکتۂ می گویمت روشن چو در | ناشناسی امتیازِ عبد و حُر
عبد را تحصیلِ حاصل فطرت است | واردات جانِ او بے ندرت است
دم بدم نو آفرینی کارِ حُر! | نغمۂ پیہم تازہ ریزد تارِ حُر
فطرتش زحمت کشِ تکرار نیست | جادۂ او حلقۂ پرکار نیست
عبد را ایّام زنجیر است و بس | بر لبِ او حرفِ تقدیر است و بس
ہمتِ حُر با قضا گردد مشیر | حادثات از دستِ او صورت پذیر

آزادیٔ ماحول کی اہمیت جاننے کے علاوہ اقبالؒ موجودہ زندگی میں تجربات و حوادث کے ذریعے حاصل کئے ہوئے علم کا منصب بھی خوب سمجھتے ہیں۔ درحقیقت کوئی حادثہ یا کوئی لغزش تجربات کی دنیا کو وسیع کرنے میں ایک لازمی جزو ہے۔ تجربات سے حاصل شدہ دن بدن پھیلتا ہوا میدانِ علم زورِ خودی کو تقویت بہم پہنچاتا ہے۔ فکرِ انسانی میں آزادی اور عمل میں جدت پسندی کے جذبے کو تحریک دینے کے لئے اقبالؒ کہتے ہیں۔

ندرتِ فکر و عمل کیا شئے ہے؟ ذوقِ انقلاب
ندرتِ فکر و عمل کیا شئے ہے؟ ملّت کا شباب
ندرتِ فکر و عمل سے معجزاتِ زندگی
ندرتِ فکر و عمل سے سنگِ خارہ لعلِ ناب

فکرِ انسانی کی آزادی اس کے دماغ میں ایک ناقدانہ نظر پیدا کر دیتی ہے۔ جو کسی بھی شئے کو پرکھے اور جانچے بغیر قبول کرنے سے روکتی ہے، اس آزادی سے تجارب کے ذریعے سبق حاصل کرنے کا رجحان پیدا ہوتا ہے، قرآن بھی روحِ انسانی کے لئے تجرباتی طریقِ عمل تجویز کرتا ہے۔ مظاہرِ فطرت پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے وہ بار بار بتاتا ہے کہ زمین چاند تارے، سورج، بادل ہوا یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں اور غور کرنے والوں کے لئے ان میں کائنات کو تسخیر کرنے والی قوتیں پنہاں ہیں۔ اس اندازِ فکر نے ہی مسلمانوں میں زندگی کے حقائق کا راز پا لینے کی جستجو کو ابھارا۔ یہاں تک کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو ماڈرن سائنس کا بانی بنا دیا۔

طبعِ انسانی کے لئے حقیقت کی تلاش کا جذبہ حقیقت کو پا لینے سے زیادہ اہم ہے یہ خودی کی بالیدگی کا سبب بنتا ہے لیکن علم و خرد کی اہمیت کو جتلانے کے باوجود اقبالؒ اس کو منتہائے نظر قرار نہیں دیتے۔ ان کا فرمانا ہے کہ علم و خرد اس لئے کہ راہِ عمل میں رہنمائی کریں اور زندگی کے مقاصد کے

حصول کا سامان بہم پہنچا ہیں۔ یا یوں کہیئے کہ زندگی گزارنے کی بہترین سبیل ہو۔ ؎

علم از سامانِ حفظِ زندگی است　　علم از اسبابِ تقویمِ خودی است

جو علم عمل کے ذریعے حاصل نہ کیا جائے اور محض کتابی ہو وہ یہ فرائض انجام دینے میں اکثر ناکام رہتا ہے۔ اسی لئے اقبالؒ چاہتے ہیں۔ ؎

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے　　کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

اور توجہ دلاتے ہیں کہ ؎

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو　　کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

خودی کے ارتقا کے لئے ایک اور چیز بھی ضروری ہے اور وہ ہے مقاصد کا تعین تاکہ عمل اور جستجو کی راہ بھی متعین ہو جائے۔ نئے اور عظیم تر مقاصد کا تعین ہی زندگی کا نصب العین واضح کرتا ہے ؎

زندگانی را بقا از مدعا است　　کاروانش را درا از مدعا است

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار　　تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

زندگی سرمایہ دار از آرزوست　　عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست

اقبالؒ کے فلسفۂ زندگی میں عمل کو زندگی کے محور کی حیثیت دی گئی ہے۔ وہ بھرپور زندگی گزارنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسی زندگی جو جدوجہد، تجربات اور تصادمات سے عبارت ہو۔ عمل کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہونا چاہیئے۔ عمل کی اہمیت نے ہی ان کو شاہین کی مثال پیش کرنے پر مائل کیا۔ کیونکہ اس کی زندگی جذبہ و جوش سے بھرپور متواتر جدوجہد کی زندگی ہے۔

آج کل کے مفکر طبیعیاتی اور حیوانی سائنسوں کی ترقی سے متاثر ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ انسانی عمل کی رہنمائی کرنے کو خرد کافی ہے۔ اقبالؒ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ خبر کو نظر پر فوقیت حاصل ہے۔ فرماتے ہیں ؎

مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ　　عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

عشق سے عاری عقل اور اخلاقیات سے خالی علم یا سائنس دنیا میں ایک غیر متوازن سماجی نظام ناانصافی پر مبنی اقتصادی نظام۔ طبقہ وارانہ کشاکش اور اسلحہ بندی کی دوڑ جیسی ناہمواریاں پیدا کرتا ہے۔ اقبالؒ علم و عشق کا امتزاج چاہتے ہیں تاکہ وہ زبردست تخلیقی قوت جو قدرت نے انسان کے دل و دماغ کو ودیعت کی ہے۔ تعمیری مقاصد میں استعمال ہو۔

ان کی رائے میں شیطان محض خرد کا پیکر یا پُتلا ہے کیونکہ اخلاقی اقدار سے باہر رہ کر طبیعی قوتیں محض گمراہی اور تباہی پیدا کر سکتی ہیں۔ اقبالؒ تلقین کرتے ہیں کہ مسلمان کو چاہیئے کہ علم کو بھی مسلمان کرے ؎ بو لہب را حیدرِ کرار کن۔ اور ؎

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبریل　　اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

گویا اقبالؒ کی نظر میں مومن ... [illegible]

دل کی رہنمائی میں ہوتا ہے۔ اقبالؒ ترکِ دنیا کو مومن کے مسلک کے دائرہ سے خارج قرار دیتے ہیں۔ اقبالؒ نے فقر کا لفظ مومن کی خوبیوں کے ضمن میں جہاں بھی استعمال کیا ہے وہ ان معنوں میں نہیں بلکہ ترغیب و تحریص سے بے نیاز رہنے کے مفہوم میں کیا ہے ؂

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد ۔۔۔ فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

فرد کے مکمل ارتقا کے لئے ایک سماج یا معاشرہ کا ہونا ضروری ہے اور اقبالؒ کا یہ ایمان ہے کہ اچھے سماجی نظام کی تلاش میں اسلام جیسے ضابطۂ حیات کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں۔ یہ ایسا منفرد و ممتاز نظام ہے جس میں انسانیت کو نسل، قومیت و رنگ جیسے فروعی امتیازات میں تقسیم نہیں کیا جاتا اس میں مساوات، عدل و انصاف اور تکریم آدمیت بنیادی اصول ہیں۔ اس میں وفاداری کا مرکز وطن، زبان، خون یا رنگ کی بجائے عقیدۂ توحید ہے۔ رنگ و نسل میں بٹی ہوئی دنیا میں یہ نظریۂ حیات نفسیاتی نقطۂ نظر سے ایک نیا مرکز بن کر سامنے آیا، اور سابقہ ذہنی قیود، بے بنیاد خوف اور اوہام کو توڑ کر آزادی کا ایک نیا احساس دلانے کا سبب بنا۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس و اطہر مسلمانوں کے جذبات اور وفاکیشی کا ایک ثانوی مرکز بنی۔ اس زاویۂ نگاہ نے مسلمانوں کا ایک زبردست متحد اور جاندار معاشرہ بنایا۔

تاریخ انسانی میں یہ پہلا معاشرہ تھا جس میں آزادی، اخوت و مساوات نے عملی دنیا میں جلوہ دکھایا۔ بلاتمیز نسل و رنگ برابر کے شہری اور قانونی حقوق سب کو دیئے گئے۔ میدان سیاست میں جغرافیائی اور نسلی حدود مٹ گئیں۔ قدیم اقدار دنیائے انسانیت میں اختلاف اور نفرت پھیلانے کا سبب بنتی تھیں۔ اسلام نے ایک خدا پر ایمان اور عالمگیر اخوت کو سیاست کا نقطۂ ماسکہ بنا کر پیش کیا۔ اسلامی دنیا میں علم سائنس کی تحقیق ایسی عدیم النظیر حد تک ہوئی کہ یورپین مستشرقین اس اعتراف پر مجبور ہوئے کہ آج کی دنیا کو عرب تہذیب کا سب سے بڑا عطیہ سائنس ملا ہے۔

بہ حیثیت مسلمان ہمیں جو آزادیٔ فکر و عمل حاصل ہے تو ہمارا فرض یہ ہے کہ دم بدم آنے والی "کن فیکون" کی صدا پر لبیک کہیں اور ناتمام دنیا کی تشکیل و تکمیل کے لئے کمربستہ ہیں۔ اسلامی نظام کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و سرفرازی کے لئے سائنس کی قوتیں بروئے کار لائی جائیں۔ علم کے دائرے کو وسیع اور عمل کے دائرے کو وسیع تر کیا جائے۔

یہی وہ فلسفۂ زندگی ہے جو حکیم الامت نے ہمیں سمجھایا ہے۔ انہوں نے صاف صاف کہا ہے کہ قومی زندگی کو تقویت مل ہی نہیں سکتی اور نصب العین پورا ہو نہیں سکتا جب تک کہ سائنس کو بدرجۂ اتم ترقی نہ دی جائے اور قومی زندگی کے روز افزوں تقاضوں کو پورا کرنے میں اس کا استعمال نہ کیا جائے۔ دیکھئے کیا کہہ گئے ہیں:۔

(اشعار اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

ے ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد ! عالمے از ذرۂ تعمیر کرد
کوہ و صحرا دشت و دریا بحر و بر ! تختۂ تعلیمِ اربابِ نظر

---

نائبِ حق در جہاں آدم شود — بر عناصر حکم او محکم شود

---

دست رنگیں کن زِ خونِ کوہسار — جوئے آب گوہر از دریا برآر

---

جستجو را محکم از تدبیر کن — انفس و آفاق را تسخیر کن

---

آنکہ بر اشیاء کمند انداخت است — مرکب از برق حرارت ساخت است

---

یہی دینِ اسلام کی تعلیم ہے اور یہی اقبالؒ کا فلسفۂ زندگی ہے۔

(ثریا عندلیب)


# انگریزی دان قارئین طلوع اسلام کیلئے مژدہ

ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب حلقۂ قارئین طلوع اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کا مابہ الامتیاز دائرہ تصنیف، انگریزی دان طبقہ میں قرآنی فکر کی اشاعت رہا ہے۔ ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔

"GATE WAY TO THE QURAN"

جو "مطالب الفرقان" ہی کے نہج پہ انگریزی میں سورۂ فاتحہ کی مفصل تفسیر ہے، حال ہی میں شائع ہوئی ہے۔ جس کا باقاعدہ تعارف آئندہ شمارے میں پیش کیا جائے گا۔

سردست قارئین مندرجہ ذیل کوائف متعلقہ نوٹ فرمالیں:

ضخامت کتاب ۱۲۰ صفحات، کاغذ اعلیٰ جلد مضبوط مزین و مطلا

قیمت فی جلد پچاس -/۵۰ روپے علاوہ محصول ڈاک

خالد پبلشرز ۳۲ نسبت روڈ لاہور

# حقائق و عبر

## ۱۔ جمعیت علماء اسلام کے چودہ ٹکڑے!

جمعیت علماء اسلام، اپنے آپ کو پاکستان میں علمائے دیوبند کی جانشین سمجھتی ہے۔ اس جماعت کے علماء کے درمیان اختلافات سنگین نوعیت اختیار کر چکے ہیں، ہفت روزہ چٹان، جو اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا ہے، نے اپنی ۱۴ اکتوبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں علماء کے ان اختلافات پر خون کے آنسو رونے کے بعد فرمایا ہے:۔

> مفتی صاحب کے بعد ان علماء کا جس طریقے سے شیرازہ بکھرا، جس طرح اس جماعت کے ٹکڑے ہوئے وہ بہت دکھ کی بات ہے۔ ابھی حال ہی میں علماء دیوبند کے ایک جید عالم دین اور مشہور و معروف دینی درسگاہ جامعہ رشید کے مہتمم نے کہا تھا کہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم ایک ہو جانے کی بجائے اس وقت چودہ (۱۴) جماعتوں میں بٹ گئے ہیں۔ اس وقت ملک میں جتنی بھی دینی و سیاسی جماعتیں کام کر رہی ہیں۔ ان میں اختلافات ضرور ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ لیکن صرف جمعیت علمائے اسلام ایسی جماعت ہے جس کے لاتعداد ٹکڑے ہوئے۔ اور قابل مذمت بات یہ ہے کہ یہ علماء حق کہلوانے والی جماعت آپس میں اسی طرح دست گریباں ہے کہ اس کے لیڈروں کو علماء حق کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔
>
> مفتی صاحب کے بعد یہ علماء اور جماعت پھر دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک کی قیادت مولانا عبیداللہ انور کرنے لگے۔ جب کہ دوسری جماعت کی قیادت مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے سنبھال لی۔ وہ گروپ کہتا ہے کہ میں حق بجانب ہوں، جب کہ دوسرا گروپ خود کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ ایک گروپ کہتا ہے کہ ایم آر ڈی کے ساتھ تعلق جائز ہے۔ جب کہ دوسرا اسے ناجائز قرار دیتا ہے۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مولانا اسعد مدنی نے دونوں کی مصالحت کرائی لیکن مصالحت تو تب ہو جب اخلاص ہو۔ جانثاری ہو۔ ایسا جذبہ نہیں بلکہ یہ جماعت پستی میں چلی گئی کہ مذہب اسلام کو مقدم سمجھنے کے بجائے علماء نے جماعت کے عہدوں کو مقدم سمجھ لیا۔

## ۲۔ اصلاحی صاحب کے دو شاگرد!

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، جماعتِ اسلامی کے بانی رکن تھے۔ پندرہ بیس سال جماعتِ اسلامی میں مختلف عہدوں پر خدمات انجام دینے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ جماعتِ اسلامی کا مقصد اسلامی نظام کا قیام نہیں، بلکہ کچھ "اور" ہے اور وہ اتنا عرصہ صحرا میں بھٹکتے رہے ہیں، چنانچہ آپ اپنے رفقاء کی ایک جماعت کے ساتھ ۱۹۵۶ء میں جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہو گئے۔

علیحدگی کے بعد ان سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ کوئی نئی جماعت بنائیں گے، تو اصلاحی صاحب نے جواب دیا کہ وہ کوئی نئی جماعت بنانے کی بجائے، تعلیمیافتہ ذہین نوجوانوں کو اسلام کی خدمت کے لئے تیار کریں گے، انہوں نے اس مقصد کے لئے جن شاگردوں کی تربیت کی ان میں سے دو حضرات اپنے اپنے ماہنامے شائع کر کے "اسلام کی خدمت" کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر "اسرار احمد" صاحب ہیں جنہوں نے مولانا امین احسن اصلاحی پر منکرِ حدیث کا فتویٰ لگا کر، انہیں اسلام سے خارج قرار دے دیا ہے۔ دوسرے شاگرد جناب جاوید احمد الغامدی جو "رسالہ اشراق" شائع کرتے ہیں۔ وہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو جاہل و اجہل سمجھتے ہیں اور ان کی اسلامی خدمات کو دین میں نیا فتنہ قرار دیتے ہیں، اکتوبر ۱۹۸۵ء کے اشراق کا شمارہ انہوں نے اسی مقصد کے لئے وقف کر دیا ہے اور ڈاکٹر اسرار صاحب کی اسلام سے جہالت کا پردہ چاک کیا ہے۔ اس کی ابتداء وہ ان الفاظ سے کرتے ہیں:۔

> اسلام پر جو حوادث اس زمانے میں گزر رہے ہیں، ان میں سے ایک بڑا حادثہ یہ بھی ہے کہ بعض وہ لوگ جو دینی علوم سے نا واقفِ محض اور ہمارے قدیم فنون کی امّہاتِ کتب میں سے دو حرف بھی پڑھ سکنے کی صلاحیّت نہیں رکھتے، محض اپنی سخن پردازی کے بل بوتے پر دین کی شرح و تعبیر فرمانے اور اس کے مہمات مسائل پر کلام کی جسارت کرتے ہیں۔
>
> اس طرح کے برخود غلط لوگ یوں تو لیڈروں اور دانشوروں کی ہر مجلس میں مل جاتے ہیں، لیکن ان میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا مقام غالباً سب سے اونچا ہے۔ موصوف کے مبلغِ علم کی حدود خود ان پر دوسروں سے زیادہ واضح ہیں۔ چنانچہ اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ خود کو "اُمّی" کہتے اور اس طرح اپنے مریدوں کو اطمینان دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کیا ہوا اگر مجھے ادبِ عربی، رجال و سیر، حدیث و فقہ اور اصول و معانی سے کچھ واقفیت نہیں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تو اُمّی، تھے۔ آپ نے ان میں سے کون سی چیز آخر کب اور کہاں پڑھی تھی!

ہم ان سے تعرض نہ کرتے، لیکن پچھلے چند سالوں سے وہ غلبۂ دین کی جدّ وجہد اور اس کے لئے التزام جماعت، بیعت، شوریٰ، ہجرت، جہاد اور بعض دوسرے اہم مسائل کے بارے میں اپنے جو اجتہادات بیان فرما رہے ہیں، اور جس کی تصویب اب ان کے بقول اس ملک کے اکابر علماء نے بھی کر دی ہے، وہ چونکہ بالکل غلط اور قرآن وسنت کے مدّعا کے بالکل خلاف ہیں، اس وجہ سے ہم ان کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر جو ہم نے بارہا مختلف لوگوں کے سوالات کے جواب میں اور ایک مرتبہ خود ان کے سامنے بھی پیش کیا ہے، پوری وضاحت کے ساتھ بہ دلائل یہاں بیان کئے دیتے ہیں۔

---

## ۳۔ ہندو عورت کی مڑھی "عقیدت کا مرکز"!

۶ اکتوبر ۱۹۸۵ء کے نوائے وقت میں "بستی بستی نگر نگر" کے کالم کے تحت لاہور میں دہلی گیٹ کی اندرونی آبادی میں ایک ہندو عورت کی مڑھی (جہاں اس کو جلایا گیا تھا) کی نشاندہی کی گئی ہے جس پر چراغاں کیا جاتا ہے اور لوگ اس کو کسی بزرگ ہی کا مدفن سمجھ کر روایتی نذر و نیاز اور منّت و استمداد کا سلسلہ جاری کئے ہوئے ہیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس کے ساتھ یہ عقیدہ بھی منسلک ہے کہ یہاں مانی جانے والی منّت ضرور پوری ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں ضعیف الاعتقادی کا یہ عالم ہے کہ جہاں کوئی پختہ قبر ہوتی ہے اسی کو لوگ حاجت روائی کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ قبر نہ ہو تو محض تھڑا بنا کر "بابا جی کی بیٹھک" "باگھجا پیر" کا مقام دے دیا جاتا ہے اور منتیں اور چڑھاوے جاری ہو جاتے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ!

علماء حضرات جب خود قبروں پر مجاور بن کر بیٹھ جائیں، تو وہ پھر جاہل عوام سے کیا توقع کر سکتے ہیں!

---

## ۴۔ مارشل لاء جاری رہنا چاہئیے!

وزیر اعظم پاکستان نے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۵ء تک ملک سے مارشل لاء ختم کرنے کا جو اعلان کیا ہے، اہل پاکستان کی اکثریت نے اسے خوش آمدید کہا ہے۔ لیکن فرقہ اہلِ حدیث کے ایک مشہور عالم دین، جو کسی وقت جماعتِ اسلامی کے صفِ اوّل کے لیڈر تھے، نے اس اعلان پر مایوسی کا اظہار کیا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ مارشل لاء ملک میں جاری رہنا چاہیئے۔ اس بارے میں وہ اپنے اخبار میں اصرار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

ہماری ناقص رائے میں حالات بشدت اس کا تقاضا کرتے ہیں کہ جب تک موجودہ جمہوری [illegible]

حکومت اس قدر مستحکم نہ ہو جائے کہ وہ اندرونی اور بیرونی شر پسندوں کے دخل اندازی اٹھائے ہوئے ہر قسم کے فتنے کا سدباب کرسکے، اس وقت تک "مارشل لاء" کو کسی نہ کسی صورت میں جاری رہنا چاہیئے، لیکن چونکہ صدر اور وزیراعظم قطعی انداز میں مارشل لاء اٹھانے کی تاریخ کا اعلان کرچکے ہیں، اس لئے اب مارشل لاء کو تو بہر نوع اس اعلان کے مطابق یکم جنوری تک اٹھا دیا جائے۔ لیکن صدر اور وزیراعظم باہمی مشورے سے کسی ایسے نظام کو تجویز کریں جو اس نوع کے خطرات کا سدباب کر سکے۔ مگر یہ بات باعثِ تشویش ہے کہ اس کی جو صورت "نیشنل سیکورٹی کونسل" کے زیرعنوان پیش کی گئی تھی اسے تو سرکاری گروپ نے ساقط کر دیا، ہمارے نزدیک اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے، ہم آزاد گروپ کے ان ارکان سے جو ضد اور انانیت سے محفوظ اور اسلام کے ساتھ وفاداری، پاکستان کی حفاظت کے جذبے اور مسلمانانِ پاکستان کے مکمل تحفظ کے جذبے سے سرشار ہیں، ان سے درخواست کریں گے کہ وہ اگر "نیشنل سیکورٹی کونسل" سے چڑ محسوس کرتے ہیں تو وہ کسی بھی دوسرے عنوان کے تحت ایسا قانون اس مسودے میں شامل کریں جسے ہنگامی حالات میں شرپسندوں کے قلع قمع اور اسلامیانِ پاکستان کے جان و مال اور خود پاکستان کی حفاظت کے فریضہ سے عہدہ برآ ہوا جاسکے۔

---

## ۵۔ مسلمانوں میں بے دینی کی وجہ:۔

پاکستان میں دیوبند سکول کے ترجمان ماہنامہ "البلاغ" اپنی اکتوبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت میں، مسلمانوں میں بے دینی کے رجحان فروغ پانے کی وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اس سلسلے میں ایک بنیادی چیز جس کی وجہ سے بے دینی کی ابتداء ہوتی ہے وہ یہ کہ گھروں میں استعمال کے لئے لائی جانے والی عام چیزوں میں تصویریں لگی ہوتی ہیں، مختلف ذرائع سے جب گھروں میں یہ تصاویر آتی ہیں جن میں اکثر عریاں تصاویر ہی ہوتی ہیں، انہیں تصاویر کی وجہ سے رفتہ رفتہ بے دینی آجاتی ہے، اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ جس گھر یا مجلس میں تصویر ہوگی تو یہ گناہ کی مجلس شمار ہوگی، جس طرح عبادت کی مجالس میں بیٹھنے سے تقویٰ، خدا کا خوف اور دینداری پیدا ہوتی ہے اسی طرح بے دینی اور گناہ کی مجالس میں بھی اس کی خباثت ضرور پیدا ہو جاتی ہے، دوسری بات یہ ہے کہ جس گھر میں تصویر ہوگی اس میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے، اور جہاں رحمت کے فرشتے نہیں آتے ہیں تو عذاب کے فرشتے ہی آجاتے ہیں، دلوں پر اس کا بھی اثر ہوگا، تیسری وجہ یہ ہے کہ جب گناہ کی چیز کھلی ہوئی رکھی ہوتی ہے، جب اسے نہیں ہٹاتے تو اس سے گناہ کی نفرت دل سے نکل جاتی ہے، اور بالآخر گناہ پر جرأت بھی ہوتی ہے، اس کے برخلاف

ان کے ہٹانے یا مٹانے سے اس کے ساتھ دل میں نفرت اور بیزاری پیدا ہو جاتی ہے، جو کسی گناہ پر ابھارنے کا ذریعہ نہ بنے گا۔ چوتھی بات یہ کہ گھروں میں لائی جانے والی عام اشیاء پر تصاویر بالخصوص عورتوں اور وہ بھی عریاں تصاویر کو دیکھ کر نوجوانوں کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں، اس سے ان کو گناہ پر دعوت ہوگی۔

(ماہنامہ البلاغ بابت اکتوبر ۱۹۸۵ء، ص ۳۴)

البلاغ کے مدیر اگر جدید علماء اسلام کی ان تحریروں کو سامنے رکھتے جنہوں نے قرآن، حدیث اور فقہ سے تصویر کا جواز ثابت کیا ہے، تو وہ اسے مسلمانوں کی بے دینی کی بنیادی وجہ قرار نہ دیتے اور اگر وہ دنیا کی دوسری قوموں کے احوال پر نظر ڈال لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ کس طرح وہ قومیں تصاویر کی مدد سے اپنے بچوں کو بہتر تعلیم دے رہی ہیں۔ ویسے اگر وہ اپنے چاروں طرف نظر دوڑاتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ مسلمانوں کی بے دینی کی وجہ حرام کی کمائی ہے جس کی وجہ سے ہمارا ماحول اس قدر پراگندہ ہو چکا ہے کہ حلال کا ایک لقمہ حاصل کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ اگر کسی نے حرام کا ایک لقمہ بھی کھایا ہو گا تو نہ تو اس کی دعا قبول ہو گی اور نہ ہی عبادت، لیکن ہمارے علماء اس بنیادی چیز کو چھوڑ کر تصویر جیسی فروعی چیز کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔

## ۶۔ کتوں کی دعا سے بارش برسنا!

ہمارے قومی ترانے کے خالق جناب ابوالاثر حفیظ جالندھری مرحوم کے حوالے سے ان کے پیرومرشد قاضی عبدالحکیم صاحب کی ایک کرامت ہفت روزہ استقلال لاہور میں ان الفاظ میں شائع ہوئی ہے:

حفیظ صاحب مزید بیان کرتے ہیں کہ ان دنوں بارش نہیں ہو رہی تھی۔ اور قحط ایسی صورت پیدا ہو گئی تھی، چند مولوی صاحبان، قاضی صاحب کے حجرہ میں تشریف لائے اور طنز کے انداز میں کہا —— "پیرجی! آپ آرام سے حجرہ میں بیٹھے ہیں اور باہر خلق خدا پانی کی بوند کو ترس گئی ہے۔!" اس پر قاضی صاحب نے فرمایا کہ بارش کی دعا کے لئے کتوں سے کہا جائے۔ یہ فقرہ سن کر مولوی صاحبان سخت برہم ہوئے اور غصے میں یہ کہہ کر چلے گئے۔

"آپ کتوں کی زبان کو خوب سمجھتے ہیں۔ اس لئے یہ فرض آپ ہی ادا کر دیں۔!"

اس کے بعد قاضی صاحب نے اپنے ایک کامی کو بلا کر کہا کہ کتوں کے لئے صبح ایک دیگ حلوہ تیار ہونی چاہیئے۔ کتوں کی دعوت ہے۔ کامی سن کر حیران و پریشان ہو گیا لیکن سوال کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ یہ بات سارے جلال پور جٹاں میں جنگل میں آگ کی طرح

پھیل گئی۔ قاضی صاحب کے ڈیرہ پر ایک کالو نامی کتا ہر وقت آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا۔ علی الصبح قاضی صاحب نے کالو کو کہا کہ اپنے ساتھیوں کو لے کر آ جائے اور ضیافت اڑائیں۔ جلال پور جٹاں کی ایک کشادہ گلی میں سینیوں میں حلوہ ڈال کر رکھ دیا گیا۔ ان گنت مرد و زن مکانوں کی چھتوں پر اور گلی کے ساتھ ساتھ کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کالو دیگر کتوں کے ہمراہ گلی میں نمودار ہوا۔ قاضی صاحب اپنے مریدوں سمیت موقعہ پر موجود تھے۔ انہوں نے کالو کو کہا کہ اپنے ساتھیوں سے کہئے کہ حلوہ کھانا شروع کریں۔ دو دو تین تین کتے ایک ایک سینی کے اردگرد ہو گئے۔ اور جلد ہی سارا حلوہ چٹ کر گئے۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے کالو سے کہا کہ کتوں کو بارش کی دعا کے لئے کہئے۔ یہ سنتے ہی تمام کتوں نے اپنے منہ آسمان کی طرف اٹھا لئے اور زور سے ہُوہُو کی آواز نکالی۔ ابھی ان کی ہُوہُو کی تان نہیں ٹوٹی تھی کہ اس قدر شدت سے موسلا دھار بارش ہوئی کہ چھتوں اور گلی میں موجود لوگ اپنے گھروں کو بھاگ نہ سکے۔ اور وہاں ہی بھیگ گئے۔

(ہفت روزہ استقلال بابت ۲۲ اکتوبر ۸۵ء صفحہ ۴۲)

اس کرامت پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں!

---

## ۷۔ جماعتِ اسلامی کا امیر اور ترجمان:-

اس سال فروری میں جو غیر جماعتی انتخابات کرائے گئے تھے، ان میں دو سیاسی جماعتوں، جماعتِ اسلامی اور مسلم لیگ نے غیر جماعتی حیثیت سے حصّہ لیا۔ اس بارے میں دوسرے سیاستدانوں نے جماعتِ اسلامی پر طرح طرح کے الزامات عائد کئے لیکن جماعت کے امیر میاں طفیل محمد صاحب، جماعتِ اسلامی کے فیصلے کی مدافعت کرتے رہے اور وقتاً فوقتاً دعوے کرتے رہے اور کر رہے ہیں، کہ جماعت کا فیصلہ صحیح تھا، لیکن اب جماعتِ اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ ایشیاء لاہور نے اندر کی کہانی بیان کی ہے۔ اس کے اپنے الفاظ ہیں:۔

غیر جماعتی انتخابات میں جن لوگوں نے حصّہ لیا ان کا غالباً خیال تھا کہ ایسے انتخابات میں کیا حرج ہے، یہ عارضی انتظام ہے اگر اس سے مارشل لاء کی بلا ٹلتی ہے تو کیا مضائقہ ہے۔ آواز جماعتوں کے بغیر بھی بلند کی جا سکتی ہے۔ لیکن آٹھویں ترمیم نے ان کو اب بتا دیا ہو گا کہ اسلحہ کے بغیر میدان میں اترنا اپنی ناکامی کا پیشگی اعلان ہے، غیر جماعتی انتخابات پر اگر بار بار اصرار کیا گیا تھا تو اس میں کوئی حکمت تھی، اس حکمت کا تجربہ ارکان پارلیمنٹ کو اب بخوبی ہو گیا ہو گا۔ غیر جماعتی نظام کی خوبی یہ ہے کہ اس میں مزاحمت منظّم نہیں ہو سکتی۔ ان انتخابات میں شریک ہونے والوں کی پہلی غلطی یہ تھی کہ وہ اس میں انفرادی طور پر

جماعتی قوت کے بغیر شریک ہوئے۔ یہ گویا اپنے اسلحہ سے دستبردار ہونے کی بات تھی۔
دوسری غلطی یہ تھی کہ انہوں نے یہ بھی نہ پوچھا کہ یہ انتخابات کس آئین کے تحت ہو رہے ہیں؟
جو شخص کسی بے ضابطہ کھیل میں شریک ہوتا ہے، اس کو پھر کھیل میں دھاندلی پر اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔ بحالی دستور ۷۳ء کا آڈر اس وقت جاری کیا گیا جب انتخابات مکمل ہو چکے تھے۔ گویا جب سوار یاں بس میں بیٹھ چکیں تب اعلان کیا گیا کہ بس کہاں جا رہی ہے۔ ارکانِ پارلیمنٹ غور کریں کہ کس وکٹ پر انہوں نے کھیلنا قبول کیا ہے؟

(ہفت روزہ ایشیا بابت ۶ اکتوبر ۱۹۸۵ء صـ۹)

معلوم نہیں جماعتِ اسلامی کے امیر صحیح کہتے ہیں یا اس کا ترجمان۔ یا یہ طرزِ عمل جان بوجھ کر عامۃ الناس کے ذہنوں کو الجھانے کے لئے اختیار کیا گیا ہے۔

---

## ۸۔ اہلحدیث کی ضد

فرقہ اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ اہلحدیث میں درود کی غلط عبارت چھپا کرتی تھی، مدیر صاحب یہ غلط عبارت احادیث میں بھی گھسیٹر دیتے تھے جس سے وہ تحریفِ حدیث کے مرتکب ہوتے تھے۔ طلوعِ اسلام نے اہلحدیث کی توجہ اس تحریفِ حدیث کی طرف دلائی تو اس نے اب درود کی عبارت تو ٹھیک کر لی ہے لیکن پھر بھی وہ عبارت اختیار نہیں کی جو سلفِ صالحین سے منقول ہے بلکہ ایسی عبارت کو صحیح کہا ہے جو مسلمانوں کے ایک فرقے نے بعد میں اختراع کی ہے اور حیرت کی بات ہے کہ اس کے باوجود اس فرقے کے لوگ اپنے آپ کو سلفی سمجھتے ہیں۔ مدیر اہلحدیث سے درخواست ہے کہ وہ حدیث کی ساری ۷۴ کتابوں کا مطالعہ کر لیں اور پھر دیکھیں کہ کسی میں "درود" کے وہ الفاظ ہیں جو اس نے اختیار کر لئے ہیں۔
اخلاق کا تقاضا تھا کہ مدیر صاحب طلوعِ اسلام کا شکریہ ادا کرتے لیکن ان حضرات سے ایسی توقع کرنا عبث ہے۔

---


## لاہور کے سامعین درس متوجہ ہوں

درسِ قرآن بذریعہ وی سی آر (V-C-R) ہر جمعہ کی صبح ۹½ بجے ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور میں ہوتا ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

# اسلامی احکامات کی غلط تعبیر!

دین اسلام کے بارے میں ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جس کا اپنا علیحدہ سیاسی اور مالیاتی نظام ہے، اس کے سیاسی نظام پر تو قومی اخبارات میں اکثر و بیشتر بحث ہوتی رہتی ہے، لیکن اس کے مالیاتی نظام کے بارے میں کسی حلقے کی جانب سے ابھی تک کوئی تفصیلات پیش نہیں کی گئیں۔ اس لئے عام قارئین تو کجا، اچھے بھلے علماء اس بارے میں اندھیرے میں ہیں اور وہ سرمایہ داری نظام میں تھوڑے بہت ردّو بدل کے بعد اسے اسلام کا مالیاتی نظام قرار دے دیتے ہیں۔

آجکل مختلف ممالک کے مالیاتی نظاموں نے جو اہمیت اختیار کر لی ہے، ان کی بابت کچھ کہنا تحصیلِ حاصل ہے۔ مختصراً، یہ کہ ان ممالک کے سیاسی نظاموں کی تشریح بھی ان کے مالیاتی نظاموں کی روشنی میں کی جاتی ہے، اسلام کے مالیاتی نظام سے ہماری غفلت سے اکثر ذہنوں نے یہ تاثر لینا شروع کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات نہیں۔ جس کی ضرب ہمارے اس دعوےٰ پر پڑتی ہے، کہ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

اسلام کے مالیاتی نظام کی بڑی خوبی یہ ہے، کہ وہ ہر انسان سے یہ توقع کرتا ہے کہ وہ محنت سے کام کرے اور دوسروں کی محنت کو کسی بھی طریقے سے ہتھیانے کی کوشش نہ کرے۔ سود، جو اس مقصد کا مؤثر ذریعہ ہے، کو اسلام میں مطلقاً حرام قرار دے دیا گیا۔ کیونکہ اس میں محنت کے بغیر صرف سرمائے کے بدلے میں آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ آمدنی دراصل، کسی دوسرے کی محنت کی کمائی ہوتی ہے، جسے سرمایہ دار اپنے سرمائے کے زور سے، اس سے چھین لیتا ہے۔ اسی لئے تو سرمایہ داری نظام کو استحصالی نظام سمجھا جاتا ہے!

اسلام کا مالیاتی نظام اس قسم کے استحصال سے پاک ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ سود بلکہ جس چیز میں سود کا شائبہ بھی پایا جائے، اسے حرام قرار دیتا ہے، علمائے اسلام نے اگرچہ بعض محدود حالتوں میں سرمایہ سے بغیر محنت کے فائدہ اٹھانے کی اجازت دی ہے، تو اس میں بھی اس امر کا خاص خیال رکھا گیا ہے، کہ کام کرنے والے کو اس کی محنت کا معاوضہ ہر صورت میں پورا پورا مل جائے۔ اس کا کسی صورت میں استحصال نہ ہو۔ اس کی مثال،

مضاربت کے اصول پر کام کرنے کی اجازت ہے۔ علمائے اسلام نے اس معاملے کی تشریح، ان الفاظ میں بیان کی ہے :۔

"لغت میں مضاربت کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ دار کسی کام کرنے والے شخص کو اس شرط پر تجارت کرنے کے لئے، سرمایہ مہیا کرے، کہ نفع تو ان دونوں میں بقدرِ حصّہ تقسیم ہوگا، لیکن اگر کاروبار میں نقصان ہوگیا تو پھر وہ سب کا سب صاحبِ سرمایہ کے ذمّے ڈالا جائے گا۔

(الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، جلد سوم صفحہ ۴۲)

پھر یہ بھی خیال رہے کہ اس مضاربت والے کاروبار میں جو حصّہ دار، عملاً کاروبار کرتا ہے، اس کے عام اخراجات بھی کاروبار کے اسی سرمایہ سے پورے کئے جاتے ہیں۔ اور سرمایہ دار کو یہ اخراجات کاروبار میں نقصان کی صورت میں بھی، ادا کرنے ہوتے ہیں۔ یعنی ان اخراجات کو وضع کرنے کے بعد نفع ونقصان کا حساب کیا جائیگا۔

ویسے مضاربت کے اصول پر کاروبار کی اجازت، عام شرعی معاملہ نہیں : بلکہ مخصوص حالات میں یہ کاروبار کی ایک محدود اجازت ہے۔ یعنی جب ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ صاحبِ سرمایہ خود کام کرنے سے عاجز ہو جائے۔ اور وہ وقتی طور پر کسی دوسرے کام کرنے والے شخص کو اپنے کاروبار میں شریک کر لیتا ہے۔ حنفی فقہ کے مشہور امام، شمس الائمۃ سرخسی فرماتے ہیں کہ لوگوں کو مضاربت کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات صاحبِ مال خود کاروبار کرنے سے عاجز ہو جاتا ہے۔ (المبسوط جلد ۲۲ صفحہ ۱۷)

لیکن چونکہ ہمارے علماء اسلام کے مالیاتی نظام کی تفصیلات سے آگاہ نہیں اور وہ سرمایہ داری نظام کو اسلامی نظام سمجھے ہوئے ہیں، اس لئے وہ مضاربت کی اسلامی اصطلاح کی تشریح بھی، سرمایہ داری نظام کی روشنی میں کرتے ہیں اور اس طرح غریب محنت کشوں کی محنت کے استحصال کی اجازت دے کر، سرمایہ دار طبقے کو اس پر عیش وعشرت کی اجازت دیتے ہیں۔

اس کی مثال جامعہ اشرفیہ لاہور کے مہتمم جناب عبدالرحمٰن صاحب کے فتاویٰ ہیں۔ جو روزنامہ جنگ لاہور کی ۴۔ اکتوبر اور ۱۱۔ اکتوبر کی اشاعتوں میں منواتر چھپے ہیں۔ چونکہ ان فتاوی سے لاکھوں لوگوں کے حرام میں پڑ جانے کا خدشہ ہے، اس لئے ان کا نوٹس لینا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں روزنامہ جنگ کی ۴۔ اکتوبر اور ۱۱۔ اکتوبر کی اشاعتوں میں جو فتویٰ شائع ہوا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

**سوال** :۔ ایک شخص کسی دوسرے شخص کو، مثلاً دس ہزار روپیہ دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تم کاروبار کرو، مجھے ہر مہینہ پانچ سو روپیہ دے دیا کرو۔ چاہے نقصان ہو یا چاہے نفع ہو۔ ایسا کرنا درست ہے۔

**جواب** :۔ اس طرح ناجائز ہے۔ البتہ اس کے جائز ہونے کی ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ میرے پیسے

لے لو اور مجھے کاروبار میں شریک کر لو۔ نفع و نقصان کا یقین کر لیا جائے۔ اس کے بعد یہ کہ حساب ہر ماہ بعد کر لیا کریں گے۔ اس وقت جو حساب بنے گا، دیکھ لیں گے مگر ہر ماہ آپ مجھے پانچ سو روپے دیتے رہیں تا کہ گھر کا انتظام چلتا رہے۔ اگر حساب کے بعد مجھے دینا آئے گا میں دوں گا، لینا آئے گا، زائد لے لوں گا۔

ملاحظہ فرمایئے کس طرح ایک معاملے کو ناجائز قرار دینے کے بعد محض شرعی حیلے سے اسے جائز قرار دے دیا ہے۔ یہ وہی مضاربت والا معاملہ ہے، جس میں محنت کش کو استحصال سے بچانے کیلئے، ہر قسم کے نقصان اور محنت کش کے اخراجات کی ذمہ داری صاحبِ سرمایہ پر ڈالی جاتی ہے۔ لیکن جامعہ اشرفیہ کے مہتمم صاحب جو اپنے آپ کو "مفتی جنگ" کے لقب سے متعارف کراتے ہیں۔ محنت کش بیچارے کو نقصان میں شریک کر کے سرمایہ دار کو اس کے استحصال کی اجازت دے رہے ہیں۔ پھر جیسا کہ واضح کیا جا چکا ہے کہ مضاربت کا معاملہ کوئی عام اصول نہیں بلکہ صرف محدود صورتوں میں، اس کی اجازت ہے لیکن روزنامہ جنگ کے مفتی اسے ایک عام اسلامی کاروباری معاملے کے طور پر پیش کر رہے ہیں اور اس طرح سرمایہ دار لوگوں کو محنت کئے بغیر دوسروں کی محنت کا پھل کھانے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ در اصل، روزنامہ جنگ میں ان کے جو فتاویٰ شائع ہوتے رہتے ہیں، ان میں وہ نوجوانوں کو محنت سے جی چرانے کی تلقین کرتے ہیں، مثلاً ان سے اکثر امتحانوں میں پاس ہونے اور کاروبار میں کامیابی کے لئے وظائف پوچھے جاتے ہیں۔ اور جنگ کے زیرِ نظر شمارہ یعنی ۴ ر اکتوبر میں بھی اسی مقصد کے لئے وظائف پوچھے گئے ہیں۔ اسلامی تعلیمات کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ طالب علموں کو محنت کرنے اور کاروبار کرنے والوں کو ایمانداری اور دیانتداری سے کام کرنے کی تلقین کرتے۔ لیکن اس کی بجائے انہیں ان کاموں میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے مختلف وظائف کی تفصیلات بتا کر انہیں محنت اور دیانتداری سے دور رکھنے کی حتی المقدور کوشش فرمائی ہے۔ اور ایسا کرتے وقت وہ قرآنِ مجید کی اس آفاقی تعلیم کو بھول گئے کہ

"لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ"

ترجمہ:۔ "انسان کے لئے اس کی محنت کے سوا کچھ بھی (جائز) نہیں"۔ (محمد ارمغان ثاقب)

---

**تعزیت** موضع غالیگے ضلع سوات سے طلوعِ اسلام کے ایک دیرینہ قاری مسمی فضلِ ربی خان صاحب کی وفاتِ حسرت آیات بتاریخ ۴ نومبر ۱۹۸۵ء دل کی حرکت بند ہو جانے سے واقع ہونے کی اطلاع بزمِ طلوعِ اسلام مردان کے نمائندہ کے ذریعہ موصول ہوئی ہے۔ جملہ احباب ادارہ طلوعِ اسلام اس غم میں شرکت کرتے ہوئے بزمِ مردان کے احباب کیساتھ دستِ بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت فرمائے۔ اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ ناظم

# افکارِ پرویز کی صدی

(مسلسل)

کہیئے کہ یہ مقامِ ماتم ہے یا ہنگامِ مسرت !

جب امت کے سامنے ان احکامِ قرآنی کی حقیقت بے نقاب تھی تو اس وقت یہی نماز اور روزے کیا نتائج مرتب کیے کرتے تھے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ۲ھ میں پہلی بار روزے فرض ہوئے انہوں نے قوم کے اندر وہ انقلاب پیدا کیا کہ ابھی سترہ روزے بھی پورے نہیں کیے تھے کہ پوری کی پوری ملت (جو اس وقت ۳۱۳ نفوس پر مشتمل تھی) مخالفین کی متحدہ قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لئے بدر کے میدان میں پہنچ چکی تھیں۔ روزے قوم کی صلاحیتوں کو کس طرح بیدار اور اجاگر کرتے ہیں، اس کی شہادت بدر کے ذرات آج تک دیتے چلے آرہے ہیں۔ یہ تھی روزہ داروں کی وہ جماعت کہ جب وہ اسطرح فاتح ومنصور واپس لوٹی ہے تو اس انقلابِ عظیم پر وجدِ مسرت سے اپنے رب کے حضور والہانہ طور پر سجدوں میں گر گئی۔ اس تقریب کا نام تھا "جشنِ عید"۔ اس لئے کہ جس قوم کے ذمہ ساری دنیا سے ظلم و استبداد مٹا کر اس کی جگہ عدل وانصاف قائم کرنے کا فریضہ عائد ہو رہا ہو ان کے جشن منانے کے انداز بھی دنیا سے نرالے ہوتے ہیں۔

## رفتارِ عالم

رفتارِ عالم کے عنوان سے افغانستان پر تنقید وتبصرہ کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا: گذشتہ مارچ میں افغانستان نے پاکستان کے خلاف پروپیگنڈے کی جس مہم کا آغاز کیا تھا اس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے، کابل ریڈیو اور افغانستان کے واحد دو اخبارات نشرِ دروغ میں پاکستان کے دوسرے ہمسایہ "ہندوستان" سے بھی دو قدم آگے جا رہے ہیں۔ ۱۲ جون کو سوائے عالم فقیر ایپی کے آدمیوں اور افغانستان کے سرحدی دستے کے سپاہیوں نے پاکستان کے ایک ہوائی جہاز پر بلا وجہ گولیاں چلائیں جن سے جہاز کو کچھ نقصان بھی پہنچا۔ جہاز نے جواب میں اس اجتماع پر گولہ باری کی۔ اس واقعہ کے بعد افغانستان اور اس کے ساتھ ہندوستان سے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا گیا کہ پاکستانی ہوائی جہاز نے افغانی علاقہ پر بمباری کی ہے جس سے نقصانِ جان بھی ہوا ہے۔ اس مفروضہ بمباری کے خلاف افغانستان میں ایک عجیب طوفانِ بدتمیزی مچایا گیا اس طوفان کا عکس دیکھنا ہو تو سرکاری اخبار "اصلاح"

کا اقتباس ملاحظہ کیا جائے جو ۱۸ جون کے پرچے میں شائع ہوا ہے۔

"پاکستان پہلے بھی ہماری تلوار کی ضرب کا مزہ چکھ چکا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم ایک بار پھر اسے یہ مزا چکھائیں ...... ثقافتی طور پر ہم افغان ضرور پسماندہ رہے لیکن میدان جنگ میں ہم دوسروں سے بہت آگے ہیں۔ ہمارا فرض ہے ہم اپنی شاندار روایات کو برقرار رکھیں ...... اور فاتحین کی یہ قوم (افغان) اپنی آزادی کے دشمنوں پر تلوار کے وار کرے"

..... ۳ جولائی کو پتہ چلا کہ پاکستان کا بدخواہ فقیر ایپی افغانستان چلا گیا ہے جہاں اس کا سرکاری طور پر خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی خبریں آنا شروع ہوئیں کہ افغان حکام ایپی کو پٹھانستان کا بادشاہ بنانے کا اعلان کرنا چاہتے ہیں۔ پاکستان نے افغانستان کی اس غیر دوستانہ۔ بلکہ معاندانہ حرکت کے خلاف احتجاج کیا۔ لیکن افغانستان دوسروں کے کھونٹے پر ایسا ناچ رہا ہے کہ وہ پاکستان کے لئے مشکلات پیدا کرنے کے ساتھ اپنی راہ میں بھی کانٹے بونے سے اجتناب نہیں کرتا۔ افغانستان میں مقیم پاکستانی باشندوں کو بلاوجہ تنگ اور گرفتار کیا جا رہا ہے ......... ڈیورنڈ لائن کے متعلق افغان نیشنل اسمبلی کے صدر نے اعلان کیا کہ وہ اسے تسلیم نہیں کرتے کیونکہ یہ حد بندی انگریزوں کے زمانہ میں کی گئی تھی اور انگریز اب جا چکے ہیں .........

**ستمبر ۱۹۴۹** اس ماہ کے لمعات میں محترم پرویز صاحب نے صوبائی امتیازات کو لعنت قرار دیتے ہوئے تحریر فرمایا:

ہندوستان میں مسلمانوں کا مطالبۂ آزادی اس دعوے پر مبنی تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے مسلمان ایک الگ قوم کے افراد ہیں اور غیر مسلم دوسری قوم کے افراد۔ یہ دعوے اس مطالبہ کی تائید میں بطورِ ایک وکیلانہ حربہ کے استعمال نہیں کیا جاتا تھا بلکہ ایک حقیقتِ نفس الامری پر مبنی تھا اور وہ حقیقت یہ تھی کہ اسلام نے تمام مدعیانِ ایمان کو بلا امتیازِ حدود و مکان، ایک قوم قرار دیا ہے چنانچہ اس دعویٰ کو فریقِ ثانی نے تسلیم کیا اور مسلمانوں نے ایک الگ خطہ میں اپنی حکومت قائم کر لی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذَالِكَ۔

ہندوستان میں مسلمان مختلف صوبوں میں بسنے تھے اور صوبائی حدود ان میں امتیازی خطوط کا باعث بن گئے تھے۔ مطالبۂ آزادی کے وقت جب تمام ہندوستان کے مسلمانوں کو ایک قوم کے رشتہ میں پرو دیا گیا تھا تو ان صوبائی امتیازات کو لعنت قرار دیا گیا اور اسے انگریز کی بداندیشی حکومت کی حکمتِ فرعونی کے شجرِ خبیث کا ثمرہ کہہ کر پکارا گیا۔ یہ بھی ایک کھلی حقیقت کا اعتراف و اظہار تھا اس لئے کہ جب تمام دنیا کے مسلمان، اختلافِ ممالک کے باوجود ایک قوم

میں بٹ گئے ہیں۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد جب مختلف صوبوں کے مسلمان ایک جگہ آکر آباد ہوئے تو ان میں صوبائی تعصب کے ایسے مظاہرے ہونے لگے جن پر دین و دانش، دونوں آنسو بہائیں۔ یہ تعصب ایسا شدید نظر آتا تھا کہ اس کے متصورہ نتائج، حساس قلوب میں تشویش انگیز خطرات پیدا کر رہے تھے۔ چنانچہ قائداعظمؒ نے اس خطرہ کو اپنی خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا اور ہر موقعہ اور ہر تقریب پر اس کی مخالفت کی۔ پریس، اسٹیج، ملاقات غیر رسمی تقاریب۔ ہر گوشہ سے اس کے خلاف آواز بلند کی گئی۔

لیکن اس کے بعد خود حکومت پاکستان نے کیا کیا؟ اس نے سال گذشتہ فیصلہ کر دیا کہ مرکزی حکومتوں کی ملازمتوں میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کی نیابت الگ الگ ہو اور تمام آسامیاں دونوں خطوں کے مسلمانوں میں نصف نصف بانٹ دی جائیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ صوبائی تقسیم کا وہ شجرِ ملعونہ جسے انگریز کی حکمت فرعونی کا ابلیسی کارنامہ کہا جاتا تھا کس طرح خود اپنے ہاتھوں، اپنے صحنِ گلستان میں پیوست کر دیا گیا اور اس کی آب یاری کیسے ذمہ دار ہاتھوں سے ہوئی۔

یہ تو تھی مشرقی اور مغربی پاکستان کی تقسیم۔ اب آگے بڑھیئے۔ حال ہی میں حکومت کے شائع کردہ ایک منشور میں کہا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کے حصہ کی آسامیاں۔ پنجاب سرحد، سندھ، کراچی، بلوچستان قبائلی علاقہ میں الگ الگ تقسیم کی جائیں گی۔
لیجئے! یہ وہ تقسیم ہے جو انگریز کے ملعون عہد میں بھی کبھی نہ ہوئی تھی۔

غور کیجئے ایک طرف زبان سے یہ کہا جاتا ہے کہ صوبائی امتیاز ایک خبیث لعنت اور مستقبل میں تشویش انگیز نتائج کا پیش خیمہ ہے اور دوسری طرف اس تعصب کی جڑیں ایسی مضبوط کی جا رہی ہیں جو کسی کے اکھیڑے نہ اکھڑ سکیں۔ معاشرتی زندگی میں صوبائی تعصب طعن و تشنیع سے آگے نہیں بڑھا کرتا۔ لیکن جب آپ صوبائی حدود کے ساتھ مستقل مفاد وابستہ کر دیں تو یہ وہ ہڈی ہوتی ہے جس پر انسان کتوں کی طرح لڑتے ہیں۔

**عید الضحےٰ** | عید الضحےٰ کے موقع پر محترم پرویز صاحب نے اپنی ایک تقریر میں فرمایا۔

مذہب کے متعلق عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک فرد کی ذاتی اصلاح کا ذریعہ ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ذاتی، اصلاح نہایت ضروری ہے۔ لیکن یہ اصلاح اصل مقصد نہیں۔ عمدہ گھڑی کے ہر پرزہ کے لئے مضبوط اور درست ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر یہ پرزے الگ الگ پڑے رہیں تو ان کی پائیداری اور مضبوطی کسی کام کی نہیں۔ یہی پرزے

جب ایک نظام کے ماتحت ایک خاص ترتیب سے ایک جگہ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں سے ہر پرزے کی حرکت کا جیتا جاگتا نتیجہ محسوس شکل میں۔ گھڑی کے ڈائل پر نمودار ہو جائے گا۔ اسلام افراد کی اصلاح سے ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتا ہے جو نظام انسانیت کو عدل پر چلا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے ایک ایسا عملی پروگرام مرتب کر دیا ہے جس میں ہر قدم اسی منزل کی طرف اٹھتا ہے۔ نماز کے لئے پانچ وقت کا اجتماع۔ تقویٰ۔ ضبط نفس۔ غیر اللہ کی محکومی سے انکار۔ اللہ کی حاکمیت کا اقرار، مرکزیت اجتماعیت۔ اطاعت امام کا عملی مظاہرہ ہے۔ جمعہ کے اجتماع میں یہ دائرہ وسیع تر ہو جاتا ہے عید کی تقریب پر اس کی حدود اور زیادہ پھیل جاتی ہیں۔ اور بالآخر حج کے میدان میں اس کی وسعتیں ساری دنیا کو اپنے اندر سمیٹ لیتی ہیں۔ رمضان المبارک کے پورے مہینے کی مشق و ریاضت کے بعد جب ذہنوں میں جلا، دلوں میں تازگیٔ ایمان، نگاہ میں مومنانہ فراست اور خون میں مجاہدانہ حرارت پیدا ہو گئی تو عید الفطر کے اجتماع میں ہر مقام سے ملت اسلامیہ کی نمائندگی کے لئے بہترین افراد کا انتخاب ہوا۔ مسلم نمائندوں کے یہ قافلے دنیا کے دور دراز گوشوں سے جنگل بیابان کوہ اور دریا کے مرحلوں کو طے کرتے ہوئے مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۔ اپنی بین الملی کانفرنس میں شرکت کی غرض سے چاروں طرف سے ایک مرکز کی طرف سمٹے چلے آ رہے ہیں۔ کوئی جماعت بلا مرکز قائم نہیں رہ سکتی۔ مسلمانوں کے فکر و نظر کا مرکز قرآن۔ اطاعت کا مرکز امیر۔ اور اجتماعیت کا مرکز وہ بیت الحرام ہے جو ایک خدا کے ماننے والوں کے مورثِ اعلیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقدس ہاتھوں سے وجود میں آیا۔

اسلام دنیا میں جس نظام کو قائم کرنے کے لئے آیا ہے اس کی بناء اس اصول پر ہے کہ تمام انسان ایک برادری کے فرد ہیں۔ وہ ان تمام غیر فطری حد بندیوں کو توڑنے کے لئے آیا ہے جس سے انسانوں کی یہ برادری مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ نسل کا امتیاز۔ رنگ اور زبان کا امتیاز۔ جغرافیائی حدود کا امتیاز۔ اس کے نزدیک سب غیر فطری حد بندیاں ہیں اس لئے خدا کے اس گھر میں جب انسان جمع ہوں گے تو باطل کے ان امتیازات میں سے کوئی امتیاز باقی نہیں رہے گا۔ چینی جاپانی۔ ہندی۔ افغانی، ایرانی۔ تورانی۔ حبشی افرنگی سب ایک ملت کی شکل میں اس عظیم الشان حقیقت کا اعلان کرنے کے لئے جمع ہوں گے کہ

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

## ماں باپ کی اطاعت

ایک نوجوان نے محترم پرویز صاحب کو لکھا "میرے ماں باپ نے میری شادی اپنی مرضی کے مطابق کی۔ اب وہ میری بیوی سے ناراض ہیں اور مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں اسے طلاق دے دوں یا اس سے ناروا سلوک کروں۔ حالانکہ میری بیوی سے میرے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ میں اس پر آمادہ نہیں ہوتا۔ تو

وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو ماں باپ کا فرمانبردار نہیں' اس لئے تو خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جائیگا۔ برائے کرم مطلع فرمائیں کہ قرآن کی رُو سے اس باب میں کیا حکم ہے؟"

اس نوجوان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے باب المراسلات کے کالم میں محترم پرویز صاحب نے تحریر فرمایا...... قرآن نے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم دیا ہے وہ کہتا ہے کہ انہوں نے تمہاری اس وقت پرورش کی تھی جب تم دوسروں کے محتاج تھے۔ اب یہ کبرسنی کی وجہ سے تمہارے محتاج ہیں۔ اس لئے تم ان کی پرورش کرو۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے لیکن تم انہیں جھڑکو نہیں۔ بلکہ ان سے نرمی سے پیش آؤ۔ لیس یہ ہے ماں باپ کے متعلق قرآن کا ارشاد۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن جو ہر نئی نسل کو آزاد پیدا کرتا ہے۔ اور انہیں اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے لئے، اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق آپ راہیں تلاش کرے اور اپنے مقدرات کے ستارے خود تراشے، وہ ان ابھرنے اور بڑھنے والی نسلوں کو ان کے فیصلوں کا متبع قرار دے گا جن کا زمانہ گزر چکا ہے؟ قرآن جو انسان کو حریت فکر وعمل کا درس دینے کے لئے آیا ہے انسان کو کبھی گزرے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا۔ اس نے خود کہا ہے کہ عمر کی زیادتی سے انسان کی عقل معکوس (اوندھی) ہو جاتی ہے کیا وہ یہ حکم دے گا کہ صحیح الدماغ نوجوان، ان کے فیصلوں کے مطابق چلے جن کی عقل اوندھی ہو چکی ہے؟ یقیناً یہ قرآن کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے...... یہ تھی قرآن کی تعلیم! لیکن جب ملوکیت کے استبداد نے انسانی حریت و آزادی کا گلا گھونٹا ہے تو ہر "زیردست" کو "بالادست" کے فیصلوں کا پابند قرار دے دیا گیا۔ سیاسی زندگی میں بادشاہ کے فیصلوں کا "روحانی زندگی" میں احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے فیصلوں کا اور معاشرتی زندگی میں بزرگوں کے فیصلے کا اب اگر ایک طرف یہ تعلیم بطور اخلاقی اساس، انسانوں کے رگ وپے میں پیوست کر دی گئی ہے کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں بباید گفت اینک ماہ و پروین

تو دوسری طرف ان کی گھٹی میں یہ افیون بھی ڈال دی گئی کہ۔

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یہی وہ دور تھا جب ماں باپ نے بھی اپنی "بزرگی" سے فائدہ اٹھایا اور یہ عقیدہ عام کر دیا کہ ماں باپ کی اطاعت فرض ہے" یعنی جب تک ماں باپ زندہ ہیں، ان کا لڑکا خواہ خود ساٹھ ستر برس کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے اپنی صوابدید کے مطابق کرے۔ اسے ان کے فیصلوں کی تعمیل کرنی ہوگی جن کی عقل کے متعلق اس کے خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اس عمر میں اوندھی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کو فرض سمجھنے والے، ساری عمر عقلی طور پر اپاہج اور ذہنی طور پر بچے کے بچے رہ

جانتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری موجودہ معاشرت (جس میں خاندانوں میں مشترکہ زندگی بسر ہوتی ہے) کا تقاضا ہے کہ افرادِ خاندان متفقہ فیصلوں کے ماتحت زندگی کی منازل طے کریں۔ اور خودسر اور سرکش نہ بن جائیں۔ لیکن خودسری اور سرکشی اور شے ہے اور اصابت رائے اور شے۔ عمرانی زندگی کے فیصلے باہمی مشاورت سے ہونے چاہئیں اور مشاورت میں کوئی کسی دوسرے کے فیصلے کا مطیع نہیں ہوا کرتا۔ ماں باپ کی اطاعت کو فرض مان لیا جائے تو اس میں مشاورت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کا فیصلہ غلط ہو یا صحیح۔ اس کی اطاعت فریضۂ خداوندی کی حیثیت سے واجب ہوگی اور یہ یکسر قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔

**اکتوبر ۱۹۴۹ء**

باب المراسلات: ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن میں مردوں کو اجازت دی گئی ہے (بلکہ حکم دیا گیا ہے) کہ وہ اگر عورت میں سرکشی دیکھیں تو انہیں سمجھائیں، اور اگر اس پر بھی وہ باز نہ آئیں تو ان سے علیحدگی اختیار کر لیں اور اگر اس پر بھی وہ اپنے آپ کو درست نہ کریں تو انہیں پیٹا جائے۔ اس سے مرد کے اختیارات ایسے وسیع ہو جاتے ہیں کہ عورت بیچاری اس کے سامنے بھیڑ بکری بن کر رہ جاتی ہے۔ کیا قرآن کا واقعی یہی منشاء ہے!

**عورتوں کو مارنا**

محترم پرویز صاحب نے اس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا۔

قرآن کا یہ منشا، قطعاً نہیں ہے۔ ہماری سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم نے قرآن کے ان احکام کو انفرادی سمجھ رکھا ہے۔ یعنی ہم یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ قرآن ہر مرد کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اور جس وقت وہ خود فیصلہ کر لے کہ عورت اپنی سرکشی سے باز نہیں آتی، اسے سزا دینی شروع کر دے۔ اور اس سزا میں مارپیٹ بھی شامل ہے۔ تعزیری احکام کے معاملہ میں سب سے پہلے یہ اصول ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ وہ احکام افراد کے لئے نہیں ہیں بلکہ حکام کے لئے ہیں۔ یعنی ان عدالتوں کے لئے جو حکومتِ قرآنی کی طرف سے ان امور کے لئے مقرر کی جائیں۔ پھر، عائلی زندگی میں اس حقیقت کو سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کی رُو سے جو حقوق و فرائض مردوں کے لئے ہیں اسی کی مثل حقوق و فرائض عورتوں کے ہیں۔ یہ قانونِ معاشرت کی اصل ہے جسے کبھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔ عائلی زندگی میں قرآن، پہلے باہمی افہام تفہیم تجویز کرتا ہے،

وان امرأة خافت من بعلها نشوزاً او اعراضاً فلا جناح علیهما ان یصلحا بینهما صلحاً (۴/۱۲۸)

اگر کسی عورت کو اپنے خاوند سے سرکشی یا اعراض کا اندیشہ ہو تو اس میں ہرج نہیں کہ وہ آپس میں صلح کر لیں۔ یعنی ضروری نہیں کہ معاملہ کو یونہی عدالت تک لے جائیں۔ اسی طرح والتی تخافون نشوزهن فعظوهن واهجروهن فی المضاجع واضربوهن (۴/۳۴) جن عورتوں سے سرکشی کا ڈر ہو تو اس کے لئے پہلے تو باہمی افہام و تفہیم سے صلح صفائی کی کوشش کرنی چاہیئے لیکن اگر معاملہ اس سے نہ سلجھے تو پھر بات حکام تک جائے گی۔ اب فیصلہ وہاں سے صادر ہوگا۔ اگر عورت کا جرم ثابت ہو گیا تو

ہلکی سزا تو یہ ہے کہ اسے، ایک مدت معینہ کے لئے خاوند سے الگ کر دیا جائے اور انتہائی صورت میں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اسے بدنی سزا دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر یہی جرم مرد کے خلاف ثابت ہوگا تو اسے بھی اسی قسم کی سزا ملے گی۔ لہٰذا یہ تعزیری احکام، عدالت کی راہنمائی کے لئے ہیں۔ سزا کی مجاز صرف عدالت ہو سکتی ہے۔ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے۔ خواہ مرد ہو یا عورت۔ حتیٰ کہ طلاق میں بھی انفرادی اختیار نہیں ہے۔ میاں بیوی دونوں کی باہمی شکر رنجی کی صورت میں، عدالت پہلے ثالث مقرر کرے گی اور ان ثالثوں کی رپورٹ کے بعد وہ فیصلہ دے گی کہ باہمی موافقت کی صورت پیدا ہو سکتی ہے یا انقطاع تعلقات ناگزیر ہے۔ کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جب چاہے اٹھ کر عورت کو طلاق دے دے (دیکھئے $\frac{4}{35}$)۔

**تصویر** تصویر کھنچوانے کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ اس کے متعلق محترم پرویز صاحب سے اکثر پوچھا جاتا رہا ہے۔ اس ماہ کے باب المراسلات میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے موصوف نے لکھا:۔

قرآن میں تصویر کی ممانعت کہیں نہیں۔ بلکہ حضرت سلیمانؑ کے تذکارِ جلیلہ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ان کے پاس دور دراز ملکوں کے اجنبی صناع جمع تھے، یعملون لہٗ مایشاء من محاریب وتماثیل ($\frac{34}{13}$) جو ان کی منشاء کے مطابق بڑی بڑی محراب دار عمارتیں اور تماثیل تیار کرتے تھے۔ تماثیل، تمثال کی جمع ہے اور تمثال میں تصاویر اور مجسمے دونوں شامل ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب (i) خدا کا ایک اولوالعزم رسول تصاویر اور مجسموں کو تیار کراتا ہو اور (ii) قرآن اس کا ذکر کر رہا ہو اور (iii) اور اس کی ممانعت کہیں نہ آئی ہو۔ تو پھر از روئے قرآن تصویر کی ممانعت کیسے ثابت ہو سکتی ہے؟ روایات میں اس کی ممانعت آئی ہے۔ لیکن اول تو روایات کا ظنی ہونا انہیں دین میں سند کی حیثیت نہیں دے سکتا۔ اور اگر ان کی صحت کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ان کی ممانعت کر دی ہو۔ اس میں شبہ نہیں کہ ازمنہ مظلمہ (زمانۂ جہالت) میں انسان، مظاہر پرست اور انسان پرست واقع ہوا تھا اس لئے وہ مجسمات اور تصاویر کی پرستش شروع کر دیتا تھا لیکن ہر مجسمہ اور ہر تصویر کی نہیں بلکہ صرف انہی کے مجسموں اور تصویروں کی جن کی اسے پرستش مقصود تھی۔ لہٰذا وجۂ ممانعت مظاہرِ فطرت یا انسانوں کی پرستش تھی نہ کہ نفسِ تماثیل۔ اگر اس دلیل کو محکم تسلیم کر لیا جائے کہ انسان (اللہ کے سوا) جن چیزوں کی پرستش کرتا ہے انہیں باقی نہیں رہنے دینا چاہیئے تاکہ دنیا سے شرک مٹ جائے، تو غور فرمایئے کہ اس سلسلہ کائنات میں کس کس چیز کو مٹانا پڑیگا۔ انسان پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کرتا ہے۔ درختوں اور حیوانوں کی پرستش کرتا ہے۔ زمین کی اور اجرامِ سماوی (چاند، سورج، ستاروں) کی پرستش کرتا ہے۔ وہ ان چیزوں کی تصاویر کی پرستش نہیں کرتا بلکہ خود ان چیزوں کی پرستش کرتا ہے تو کیا اس شرک کو مٹانے

کے لئے ان تمام چیزوں کو مٹا دیا جائے گا جن کی یہ پرستش کرتا ہے! کیا ان کا مٹانا ممکن بھی ہے! انسان پرستی میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی تصاویر یا ان کے مجسمے مٹا دینے سے ان کی پرستش نہیں ہوگی۔ لیکن ذرا گہرائیوں میں جا کر دیکھئے کہ کیا ان کے مٹانے سے واقعی شرک مٹ جاتا ہے۔ اگر آپ ان تصاویر کو مٹا بھی دیں گے تو ان تصاویر کو کیا کریں گے جو انسان نے اپنے قلب کے چوکھٹوں میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ آپ اگر "شیخ" کی تصویر سامنے نہیں رکھنے دیتے تو وہ مراقبہ میں "تصورِ شیخ" سے اپنے سینہ کو بتکدہ بنا لیتا ہے۔ سو اصل شئے انسان کے دل و دماغ کے بتکدوں کو معبودانِ باطل سے پاک کرنا ہے۔ اگر ان کی تطہیر ہو جائے تو خارجی معبود (تصاویر اور مجسمے، بلکہ زندہ انسان) از خود فنا ہو جاتے ہیں لیکن اگر ان میں یہ بت موجود رہیں تو محسوس و مشہود بتوں (تصویروں اور مجسموں) کے استیصال سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ کتنے مسلمان ہیں جو تصویر کشی، مجسمہ سازی، قبر پرستی کو حرام سمجھتے ہیں لیکن انکے سینوں کو ٹٹول کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان میں کتنے کتنے بڑے لات اور منات اور ہبل اور عزیٰ چھپے بیٹھے ہیں۔

رہ مدہ اقبالؒ را در کعبہ اے شیخ حرم
ہر زماں در آستیں دارد خدا وندے دگر

**نومبر ۱۹۴۹ء** اس ماہ معارف القرآن کی جلد چہارم "معراجِ انسانیت" کے نام شائع ہوئی۔ یوں تو معارف القرآن کی ہر جلد اپنا جواب آپ ہے لیکن جلد چہارم سابقہ تین جلدوں پر بھی سبقت لے گئی ہے۔ یہ جلد تذکارِ جلیلہ حضور سرورِ کائناتؐ پر مشتمل ہے اس لئے اس میں محترم پرویز صاحب کے تدبر فی القرآن کے ساتھ عشقِ رسول کا سوز و گداز بھی شامل ہے۔ حضورؐ نبی آخر الزمان کی الیسی سیرت جس کا ماخذ قرآن کریم ہو، اسلامی لٹریچر میں ایک عدیم النظیر تالیف ہے۔ اس پر محترم پرویز صاحب کا قلم کہ جو مذہب، فلسفہ اور اخلاق جیسے خشک موضوعات کو بہارِ گلستاں بدامن بنا دیتا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب یہ تمام خصوصیات یکجا جمع ہو جائیں تو وہ کتاب کیسی ہوگی؟ کتاب کے شروع میں قریب پونے دو سو صفحات پر پھیلا ہوا عنوان "ظہر الفساد فی البر و البحر" ہے جس میں تمام دنیا کے مذاہب تمدن اور تہذیب کے غائر مورخانہ مطالعہ سے یہ حقیقت بے نقاب کی گئی ہے کہ ظہورِ اسلام کے وقت دنیا کی کوئی مستقل قدر اپنی جگہ پر قائم نہ رہی تھی۔ یہ عنوان بجائے خویش ایک مستقل تصنیف ہے اور محترم پرویز صاحب کی وسعتِ معلومات اور تبحرِ علمی کا آئینہ بردار۔ ۸۳۲ صفحات پر مشتمل اس کتاب میں آفتابِ جہاں تاب کا سرزمین عرب میں طلوع۔ ادراکِ حقیقت۔ دنیائے انسانیت میں انقلاب۔ مقامِ نبوت کی وضاحت۔ ایمان کی بے پناہ قوت۔ نبی اکرمؐ پر شدید مظالم۔ صبر و استقامت کی آزمائش۔ اربابِ مذہب۔ اربابِ دولت۔ اربابِ حکومت۔ اربابِ حشمت اور اربابِ نسب کی مخالفت۔ تنذیر و تبشیر کا مفہوم۔ قیامِ صلوٰۃ کا عملی مظاہرہ۔ جماعت کی تشکیل

سبعیت کا مفہوم، ہجرت۔ وطن کا مفہوم۔ مدینہ میں تشریف آوری۔ مسجدِ نبوی کی تعمیر۔ مرکزِ ملت کی اہمیت۔ ملت کی تشکیل۔ جہاد۔ مذہب اور دین کا فرق۔ عدل کا مفہوم۔ غزوۂ بدر۔ جنگ احد جنگ احزاب۔ غزوۂ خیبر۔ فتح مکہ۔ جنگ حنین۔ غزوۂ تبوک۔ واقعہ افک۔ خلافت و ملوکیت وحی غیر متلو کی حقیقت۔ معجزات کی حقیقت۔ معراج۔ حضور کی عائلی اور معاشرتی زندگی۔ خطبہ حجۃ الوداع۔ ختم نبوت کا صحیح مفہوم۔ مغربی مفکرین کی آراء۔ جیسے موضوعات پر قرآن کریم کی روشنی میں حسین و جمیل مرقع شامل ہے۔ یہ کتاب درحقیقت محترم پرویز صاحب کے علم و بصیرت اور عشقِ محبت کا نقطۂ معراج ہے۔

## لمعات (کچھ اپنے متعلق)

اس ماہ "لمعات" اور "کچھ اپنے متعلق" کے عنوان سے محترم پرویز صاحب نے رسالہ طلوعِ اسلام اور تحریکِ طلوعِ اسلام کا تعارف کراتے ہوئے تحریر فرمایا ہے۔

طلوعِ اسلام کی نشاۃ جدید کو دو سال ہونے کو آئے۔ اس دوران ہم نے اپنے متعلق کبھی ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن میں حلقہ طلوعِ اسلام کو شامل کر لینا ضروری ہے۔ اس لئے ہم نے مناسب خیال کیا ہے کہ اشاعت حاضرہ میں یہ گذارشات آپ تک پہنچا دی جائیں۔

قارئین طلوعِ اسلام میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں اس سے ایک "خریدار" سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ یہ حضرات ہماری ان گذارشات کے مخاطب نہیں ہیں۔ ان کا مخاطب ہے وہ طبقہ جسے اس سے قلبی لگاؤ ہے۔ جو اسے اپنے خیالات کا ترجمان اور اپنے تاثرات کا مظہر سمجھتے ہیں وہ نہ طلوعِ اسلام کو محض ایک جنس سمجھتے ہیں اور نہ طلوعِ اسلام انہیں محض خریدار تصور کرتا ہے۔

طلوعِ اسلام محض ایک رسالہ نہیں بلکہ یہ ایک دعوت کا نقیب اور ایک تحریک کا داعی ہے اس کی اشاعت ایک خاص مقصد کے ماتحت عمل میں آئی ہے اور اس کا ہر قدم ایک خاص نصب العین کی طرف منجر ہے۔ اس نے علیٰ وجہ البصیرت دیکھ لیا ہے کہ جس اسلام کو آج مسلمان اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہے وہ قطعاً وہ اسلام نہیں ہے جسے اس کے خدا نے دیا تھا اور جسے اس کے رسول اکرمؐ نے عملاً متشکل کر کے دکھایا تھا۔ اس کا موجودہ اسلام مجموعہ ہے، چند بے روح عقائد اور چند بے جان رسومات کا۔ یہ ہزار برس سے انہی بے روح عقائد اور بے جان رسومات کو عین دین سمجھے ہوئے چلا آرہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر نیا سورج اس کے لئے ذلت و ادبار اور نکبت و افلاس کا رسوا کن عذاب لے کر نمودار ہوتا ہے۔ آج دنیا میں تعداد کے لحاظ سے اور جغرافیائی پوزیشن کے اعتبار سے مسلمانانِ عالم کو سب سے زیادہ طاقتور ہونا چاہیئے تھا اور اس نصب العین اور پیغام کی رو سے جس

کا اس قوم کو حامل بنایا گیا تھا۔ اسے انسانیت کا امام بننا چاہیئے تھا لیکن بایں کثرت وحسنِ مؤقف، ان کی حالت یہ ہے کہ یہ اپنی زندگی اور بقاء کے لئے اقوام یورپ کے رحم وکرم پر ہیں۔ کوئی انہیں زندہ قوموں میں شمار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ اسی وقت تک سانس لے سکتے ہیں جب تک یورپ کی طاقتیں اپنے مصالح کے ماتحت انہیں سانس لینے کی اجازت دیں۔ باقی رہا شرفِ انسانیت، سو جو قوم اپنی زندگی تک کے لئے دوسروں کی محتاج ہو، اسے شرفِ انسانیت سے کیا تعلق؟

ان علاماتِ مرض کو دیکھ لینے کے بعد، طلوع اسلام نے علتِ مرض کو بھی پہچان لیا اور علاج کا نسخہ بھی اس کے سامنے آگیا۔ علتِ مرض یہ ہے کہ مسلمان نے انسانوں کے بنائے ہوئے نظامِ زندگی کو ابدی حقائق تصور کر رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ عملی دنیا میں ایک قدم بھی آگے نہیں چل سکتا اور اس کا علاج یہ ہے کہ یہ ان تمام غلط نظامہائے زندگی کو الگ کرکے اس مسلکِ حیات کو اپنانے جو قرآن کی دفتین میں محفوظ چلا آتا ہے اور جس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اسے پھر آگے جانے والے سے آگے لے جائے اور اس کے ساتھ ہی انسانیت کو اس منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔

ہم جانتے ہیں کہ رجعت الی القرآن (BACK TO THE QURAN) ہمارے دور کا ایک عام نعرہ اور نشین میں داخل ہو چکا ہے جس مقرر کو سنیئے وہ ایک ہی سانس میں ان پرشکوہ الفاظ کو دہرا دیتا ہے کہ ہماری معاشی، معاشرتی، تمدنی، ثقافتی، عمرانی، اقتصادی، سیاسی، روحانی روحانی، غرضیکہ دین ودنیا کی پوری زندگی کا مکمل ضابطۂ حیات قرآن کے اندر موجود ہے لیکن جب اس سے کہئے کہ ذرا الفاظ کی اس آسمانی دنیا سے نیچے اتر کر، واقعات کی اس زمینی دنیا پر آکر گفتگو کیجئے، تو اس کے پاس اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ نہیں؛ اتنا ہی نہیں بلکہ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ یہی لوگ جو منبروں اور اسٹیجوں سے اسی قسم کے اعلانات کرتے رہتے ہیں، دوسری ہی سانس میں یہ بھی کہتے ہیں کہ قرآن میں تو نمازتک کی ترتیب وتشکیل کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ لیکن طلوع اسلام نے جب اس دعویٰ کو پیش کیا ہے تو بلا دلیل پیش نہیں کیا۔ وہ اسے اپنا ایمان سمجھتا ہے اور اس کے اثبات میں اپنے پاس دلائل وتفاصیل رکھتا ہے۔

اس تشخیصِ مرض اور تجویزِ علاج کے بعد سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس علاج کی عملی شکل کیا ہو۔ بیمار کا یہ عالم ہے کہ وہ طبیب کو دشمن سمجھتا ہے اور دوا کو زہر۔ وہ سکراتِ موت کی ہچکیاں لے رہا ہے لیکن اپنے آپ کو بالکل تندرست وتوانا سمجھے بیٹھا ہے اور اسے بیمار کہنے والے کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتا ہے۔

طلوع اسلام کے سامنے یہ مشکل بھی ہے اور اسے اس کا پورا پورا احساس ہے۔ اس نے یہ سمجھ لیا ہے کہ خارجی دنیا میں کسی انقلاب کا امکان نہیں جب تک پہلے داخلی دنیا میں تبدیلی نہ پیدا کر دی جائے جب تک مسلمان کی ذہنی فضا میں تطہیر نہیں ہوتی۔ اس کی خارجی زندگی کثافتوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ اس نے اپنے سامنے قلوب و اذہان میں انقلاب پیدا کرنے کا پروگرام رکھا ہے۔ یہ مرحلہ بڑا صبر آزما اور ہمت شکن ہے۔ زمانہ ہنگامہ آرائی کا خوگر ہے اور ذہنی انقلاب پر سکوت خاموشیوں سے اپنی منازل طے کیا کرتا ہے۔ ہنگامہ پسند مسلمان، جسے منار پرستیوں نے برسوں سے بگولے کے رقص اور جھگڑے کے جوش و خروش کا تماشائی بنا رکھا ہے۔ اس قسم کے خاموش انقلاب کو "بے عملی" کی زندگی سمجھتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غوغا آرائیوں اور ہنگامہ پرستیوں میں ایک خاص لذت ہوتی ہے اور بہت سے بیش یا افتادہ مفاد بھی۔ اس لئے خاموش انقلاب کا مرحلہ نہ صرف ہمت شکن ہوتا ہے بلکہ بہت سی آزمائشوں کا موجب بھی۔ آپ اپنی گذشتہ پچاس سالہ سیاسی اور معاشرتی زندگی کی تاریخ کو سامنے لائیے اور پھر دیکھئے کہ کتنی تحریکیں تھیں جو خلوصِ نیت اور جوش عمل کو لئے ہوئے اٹھیں لیکن بعد میں، بیش یا افتادہ مفاد کی ترغیب و تحریص کی تاب نہ لاتے ہوئے، ہنگامہ آرائیوں کے طوفان میں بہہ گئیں۔ آغاز کو دیکھئے تو للّٰہیت اور تقویٰ کے تقدس عزائم، اور انجام دیکھئے تو وہی پارٹی بازی اور الیکشن سازی! ان حالات میں جبکہ خارجی حوادث کی تلاطم خیزیاں اور مفاد پرستی کی موج انگیزیاں بڑے بڑے صاحبانِ عزم و ہمت کے پاؤں اکھیڑ دیں۔ ایں و آں سے کان بند کئے، خاموش انقلاب کی دشوار گزار وادیوں کو طے کئے جانا، کچھ آسان کام نہیں للہ الحمد کہ طلوعِ اسلام اس وقت اس آزمائش میں پورا اتر رہا ہے۔ اس کے بہت سے بہی خواہوں نے باصرار تقاضا کیا ہے، اور ان کے تقاضے بدستور جاری ہیں کہ طلوع اسلام کو اب اپنی جماعت بنانی چاہیئے اور اس طرح کچھ "عملی" کام کرنا چاہیئے۔ وہ نہیں جانتے کہ بغیر نام رکھے طلوعِ اسلام کی جماعت کس طرح بن رہی اور پھیل رہی ہے اور اس کا یہ کام کسقدر "عملی" کام ہے۔ ہر وہ شخص جو طلوع اسلام کے خیالات سے ہم آہنگی محسوس کرتا ہے اس کی بے نام جماعت کا دوامی رکن ہے اور اس "بے عمل" ادارہ کا خاموش رکن۔

(جاری ہے) (محمد اسلام صاحب)

(اس کے آگے اگلے شمارہ میں پڑھیئے)